میڈونا
ترکی ادب کا مقبول ترین ناول
Sabahattin Ali
KÜRK
MANTOLU
MADONNA
صباح الدین علی
مترجم: ہما انور

# میڈونا

ترکی ادب کا مقبول ترین ناول

# میڈونا

ترکی ادب کا مقبول ترین ناول

صباح الدین علی

مترجم: ہما انور

جمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

| | |
|---|---|
| • نام کتاب۔ میڈونا۔ترکی ادب کا مقبول ترین ناول | |
| • مصنف۔صباح الدین علی | • مترجم۔ ہما انور |
| • اشاعت۔2019ء | • سرورق۔مصباح سرفراز |
| • ناشر۔جمہوری پبلیکیشنز لاہور | • جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ |

ISBN:978-969-652-157-0

قیمت 680 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی



**Jumhoori Publications**

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan

T: +92-42-36314140 +92-42-36283098

Mobile: 0333-4463121

info@jumhooripublications.com

www.jumhooripublications.com

Sabahattin Ali

Madonna in a Fur Coat
(Kürk Mantolu Madonna)



This Book is published with the arrangements of
Telif Haklari ONK Ajans Ltd. Sti.

Urdu Translation "**Madonna**"

by Huma Anwar

Published by Jumhoori Publications - Pakistan

August 2019



**Publisher : Farrukh Sohail Goindi**

# صباح الدین علی

صباحت الدین علی، ترکی کے مقبول ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اور صحافی ہیں۔ وہ 25 فروری 1907ء کو آرڈینو، موجودہ بلغاریہ میں پیدا ہوئے جو تب سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھا اور 12 اپریل 1948ء کو بلغاری سرحد پر کرک قلعہ میں دُنیا سے کوچ کر گئے۔ صباحت الدین علی، استنبول کے ایجوکیشن سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تدریس کے پیشے سے منسلک ہوئے۔ 1928ء میں انہیں وزارتِ تعلیم کی طرف سے جرمنی بھجوایا گیا۔ 1930ء میں وطن واپسی پر انہوں نے ایدین، قونیہ اور انقرہ کے ہائر سیکنڈری سکولوں میں جرمن زبان پڑھائی۔ پھر کچھ عرصہ وزارتِ تعلیم سے منسلک پبلشنگ ادارے میں کام کیا۔ وہ ترجمہ نگاری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کچھ عرصہ سرکاری ڈرامہ کونسل میں بھی اپنے ہنر کا لوہا منوایا۔ اسی اثنا میں انہوں نے استنبول میں مارکو پاشا نامی ایک اخبار کا اجرا کیا۔ اپنی نظموں اور سیاسی نظریات کے باعث انہیں قید و بند اور مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کی طرف سے مسلسل عتاب کا نشانہ بننے کی وجہ سے انہوں نے ملک سے فرار کا ارادہ کیا، لیکن کرک قلعہ کے گردونواح میں رہائش پذیر ایک سمگلر کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

1925ء اور 1926ء میں بالیکسر میں ارماک نامی جریدے میں ان کی پہلی تحریروں کا تعارف نظر آتا ہے۔ صباحت الدین علی نے 1930ء کی دہائی میں کہانیوں میں ایک حقیقی اور نئی جہت کے ساتھ ایک نئی زندگی بیدار کی۔ انہوں نے تین مقبولِ عام ناول تحریر کیے۔ افسانوی اور شعری مجموعے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کی جائے پیدائش بلغاریہ میں ان کی تحریریں بہت پسند کی جاتی ہیں جہاں 2007ء میں ان کی پیدائش کی صد سالہ تقریبات بھی منائی گئیں۔

''میڈونا'' ان کے ناول Kürk Mantolu Madonna کا اردو ترجمہ ہے جو انگریزی میں Madonna in a Fur Coat کے نام سے شائع ہوا۔ اس سے قبل جمہوری پبلیکیشنز کے تحت ان کے ناول Kuyucaklı Yusuf (Yusuf of Kuyucak) کا اردو ترجمہ ''کم سخن یوسف'' بھی شائع ہو چکا ہے۔

اپنی زندگی میں مجھے جن لوگوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا، ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے مجھ پر کوئی تاثر چھوڑا ہوا۔ مہینوں گزر چکے ہیں لیکن راعف آفندی کا خیال اب بھی میرے ذہن پر حاوی ہے۔ یہاں تنہا بیٹھے ہوئے، میں اس کا مخلص چہرہ بہ خوبی دیکھ سکتا ہوں، کہیں دُور نگاہیں جمائے ہوئے لیکن اس کے باوجود ہر راہ گیر کا مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہوئے۔ وہ پھر بھی بہ مشکل ہی کوئی غیر معمولی شخص تھا۔ بلاشبہ، کسی حد تک وہ ایک عام سا شخص تھا جس کے خط وخال کسی طرح غیر معمولی نہ تھے...... ان سینکڑوں لوگوں سے قطعی مختلف نہیں جن سے کسی عام دن میں ہم ملتے اور ان پر کوئی توجہ دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ بلاشبہ، اس کا زندگی کے کوئی بھی پہلو...... نجی یا عوامی ...... ایسے نہ تھے جو کسی تجسس کو جنم دیتے۔ یوں بالآخر وہ ایک ایسا شخص تھا جو ہمیں اپنی ذات سے یہ استفسار کرنے پر مجبور کر دیتا: ''یہ کس لیے زندہ ہے؟ زندگی میں اس کے لیے کیا رکھا ہے؟ کیا منطق اسے سانس لینے پر مجبور کرتی ہے؟ کس فلسفے کے تحت وہ اس کرۂ ارض پر بھٹک رہا ہے؟'' لیکن اگر ہم محض سطحی نظر سے دیکھیں، تو ہم خوامخواہ ہی یہ سوال پوچھتے ہیں...... اگر ہم یہ فراموش کر دیں کہ سطح کے نیچے ایک اور عالم بپا ہے جس میں ایک مقفل ذہن تنہا گردش میں ہے۔ شاید کسی ایسے شخص کو ٹھکرانا آسان ہے جس کا چہرہ اس کی باطنی زندگی کی عکاسی نہ کرتا ہو۔ اور کیا ستم ظریفی ہے: اُن خزانوں کو اتفاق سے پالینے کو جس کی ہم نے کبھی توقع نہ کی ہو، بس ذرا سا

تجسس درکار ہوتا ہے۔ ہیرو کو اژدھے کے بھٹ میں بھیج دو، اس کا کام مکمل۔ وہ کسی دوسری قسم کا ہیرو ہوگا جو خود کو کسی ایسے کنویں میں اتارنے کی ہمت و حوصلہ مجتمع کر سکتا ہے جس کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔ یقیناً میرا معاملہ ایسا نہیں تھا؛ اگر میں راعف آفندی سے واقف ہوا تو پھر یہ ایک محض خالص اور سادہ اتفاق ہی تھا۔

بینک میں اپنے معمولی سے عہدے سے محروم ہونے کے بعد...... مجھے ابھی تک یقین نہیں کہ کیوں، ان کا کہنا تھا کہ یہ محض خرچ کم کرنے کا معاملہ تھا، لیکن ایک ہفتے کے اندر ہی انہوں نے ایک اور شخص کی خدمات حاصل کر لیں...... مجھے انقرہ میں ملازمت کی تلاش میں طویل وقت صرف کرنا پڑا۔ اپنی بچی کھچی جمع پونجی کے ذریعے میں نے موسم گرما تو جیسے تیسے گزار لیا لیکن موسم سرما آتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ دوستوں کے صوفوں پر سونے کے دن ختم ہونے کو تھے۔ میرے ریستوران راشن کارڈ کی معیاد بھی ہفتے کے اندر ختم ہونے کو تھی اور میں اس کی تجدید بھی نہیں کروا سکتا تھا۔ نوکری کی ہر نا کام و مسترد درخواست نے میری امیدوں کا دم گھونٹ دیا، حتیٰ کہ چاہے مجھے شروع سے ہی معلوم تھا کہ ملازمت کے امکانات صفر تھے؛ پھر بھی میں اپنے دوستوں سے الگ ہو کر، سیلز مین کی حیثیت سے ملازمت کی تلاش میں دکان دکان پھرتا، جب ہر کوئی مجھے مسترد کر دیتا، تو میں عالمِ مایوسی میں نصف شب تک آوارہ گردی کرتا رہتا۔ وقتاً فوقتاً میرے دوست مجھے رات کے کھانے پر مدعو کرتے لیکن ان کے ساتھ کھانے پینے سے لطف اندوز ہونے کے باوجود مجھ پر پریشانی بدستور طاری رہتی۔ اور پھر انتہائی عجیب وغریب بات ہوئی: جس قدر میرے حالات دگرگوں ہوتے گئے، جتنا کم مجھے یقین ہونے لگا کہ اگلا دن گزرے گا کیسے، مدد طلب کرنے میں میری شرم اور ہچکچاہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں جب کبھی کسی سڑک پر اپنے دوست کو دیکھتا...... دوست جو ماضی میں مجھے مشورے دینے پر آمادہ رہا تھا کہ مجھے کہاں ملازمت تلاش کرنی چاہیے...... اور میں اپنا سر جھکائے تیزی سے اس کے پاس سے گزر جاتا۔ میرا رویہ اپنے ان دوستوں سے بھی بہت مختلف ہو گیا جن سے میں کسی زمانے میں کھل کر کھانا طلب کر لیا کرتا تھا، یا ان سے بہ خوشی قرض لیا کرتا تھا۔ جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیسا تھا، میرے ہونٹوں پر ایک بے ڈھنگی مسکراہٹ نمودار ہوتی اور میں کہتا، ''اچھا ہوں...... مجھے اِدھر اُدھر کوئی چھوٹا موٹا کام مل

جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں ان سے رخصت طلب کرتا۔ دوستوں کی مجھے جس قدر ضرورت ہوئی، اتنا ہی میں ان سے پرے بھاگنے کی خواہش رکھنے لگا۔

ایک شام میں سٹیشن اور نمائش ہال کے درمیان خاموش سڑک پر انقرہ کے موسم خزاں کی خوب صورتیوں سے لطف اندوز ہوتے چہل قدمی کر رہا تھا، اس امید میں کہ شاید میرا دل بہل جائے۔ پیپلز ہاؤس کی کھڑکیوں سے منعکس ہوتی دھوپ اس سفید سنگ مرمر کی عمارت پر خون رنگ دھبے بنا دیئے تھے، صنوبر کے نوخیز پودوں اور کیکر کے درختوں پر دھوئیں کا بادل منڈلا رہا تھا جو بھاپ یا گردوغبار بھی ہوسکتا تھا، جبکہ کسی تعمیراتی مقام یا کہیں اور سے واپس آتے کیچڑ آلود لباس پہنے مزدوروں کا گروپ تارکول کی نشان زدہ سڑک پر کڈھب سی خاموشی میں چلا جا رہا تھا...... اور اس منظر میں موجود ہر چیز جہاں تھی وہیں مطمئن تھی۔ دنیا میں سب اچھا تھا۔ ہر چیز اپنے مناسب مقام پر تھی۔ میں نے سوچا، میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہ کرسکتا تھا۔ تبھی ایک تیز رفتار گاڑی میرے قریب سے گزری۔ ڈرائیور کی محض ایک جھلک سے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ کچھ فاصلے پر جا کر گاڑی رک گئی اور اس کا دروازہ کھلا۔ اس کے دروازے سے میرا پرانا ہم جماعت حامدی جھانک کر میرا نام پکار رہا تھا۔

میں اس کے قریب چلا گیا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے استفسار کیا۔

''کہیں نہیں، میں محض چہل قدمی کر رہا ہوں۔''

''پھر بیٹھو۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو!''

جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مجھے کار کے اندر دھکیل کر اپنے ساتھ والی نشست پر بٹھا لیا۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس فرم کی ملکیتی متعدد فیکٹریوں کے دورے کے بعد واپس اپنے گھر جا رہا تھا جس میں وہ اب کام کرتا تھا: ''میں نے گھر ٹیلی گرام بھیج دیا ہے کہ میری آمد کس وقت متوقع ہے۔ اس لیے سب کچھ تیار ہوگا۔ ورنہ میں تمہیں کبھی اپنے گھر جانے کی دعوت نہ دیتا!''

میں ہنس دیا۔

کسی زمانے میں حامدی اور میری اکثر ملاقات رہتی تھی لیکن جب سے میری ملازمت چھوٹی تھی، میں اس نہ ملا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ خوش حال زندگی بسر کر رہا تھا کیوں کہ وہ ایک ایسی فرم میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا جو مشینری کی تجارت کرتی تھی اور ساتھ ساتھ جنگلات کو ترقی دینے کا کام اور عمارتی لکڑی کا کاروبار بھی کرتی تھی۔ اور خصوصاً یہی وجہ تھی کہ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد میں اسے نہیں ملا تھا: کیوں کہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ سوچے گا کہ میں اس سے ملازمت نہیں بلکہ قرض وغیرہ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا۔

''کیا تم ابھی تک اسی بینک میں کام کر رہے ہو؟'' اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''میں بینک چھوڑ چکا ہوں۔''

وہ حیران نظر آیا۔

''تو پھر اب تم کہاں کام کر رہے ہو؟''

نیم دلی سے میں نے کہا، ''کہیں بھی نہیں، میں بے روزگار ہوں!''

اس نے میرا بھرپور جائزہ لینے کے لیے اپنا رخ میری طرف موڑا اور میرے لباس پر نظر ڈالی اور پھر یوں جیسے وہ مجھے یہ احساس دلا رہا ہو کہ اسے مجھے اپنے گھر مدعو کرنے پر کوئی افسوس نہیں، وہ مسکرایا اور دوستانہ انداز میں میری کمر پر تھپکی دی۔ ''فکر مت کرو۔ ہم آج رات گفتگو کریں گے اور کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے!''

وہ بہت زیادہ پُراعتماد، بہت خوش دکھائی دیا۔ بلاشبہ، وہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے کی سخاوت سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ مجھے اس پر کس قدر رشک آیا!

اس کا گھر چھوٹا لیکن خوب صورت تھا؛ اس کی بیوی گھریلو خاتون لیکن ملنسار تھی۔ کسی بھی خجالت کے بغیر انہوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ پھر حامدی مجھے چھوڑ کر غسل خانے چلا گیا۔

اس نے اپنی بیوی سے میرا باضابطہ تعارف نہیں کروایا، اس لیے میں بیٹھک میں کھڑا سوچنے لگا کہ اب میں کیا کروں۔ لیکن راہداری میں منڈلاتی اس کی بیوی چپکے چپکے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کے متعلق غور کر رہی تھی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی کہ مجھے بیٹھنے کا کہے یا نہ کہے۔ لیکن اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور وہاں سے کھسک گئی۔

جب میں خود سے یہ استفسار کر رہا تھا کہ حامدی مجھے اس طرح لٹکتا چھوڑ کر کیوں چلا گیا کیوں کہ مجھے علم تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی باتوں کے متعلق بہت نازک مزاج تھا...... اگر کہا جائے تو کہیں زیادہ نازک مزاج...... جیسا کہ اس کا خیال تھا کہ اس قسم کی توجہ واحتیاط کامیابی کا لازمی جزو ہوتی ہے۔ شاید یہ اہم عہدوں تک پہنچنے والوں کی رمز تھی کہ وہ اپنے پرانے (لیکن کم کامیاب) دوستوں کی طرف دانستہ کم توجہ کریں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ نرم اور سر پرستانہ لہجہ اپناتے ہوئے آپ انہیں ہمیشہ قدرے رسمی انداز میں مخاطب کرتے ہیں تاکہ گفتگو کے دوران کسی بے معنی سوالات سے انہیں ٹوک سکیں، اکثر اوقات ایک نرم اور ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ...... حالیہ دنوں میں مجھے اکثر اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا رہا تھا، اس لیے اس وقت حامدی کے اس طرزِ عمل پر غصہ کرنے کا خیال بھی مجھے نہ آیا۔ اس وقت میں محض اس ناگوار صورتِ حال سے نجات چاہتا تھا۔ لیکن عین اسی لمحے ایک دیہاتی خاتون سر پر سکارف باندھے، سفید پیش بند میں ملبوس اور پاؤں میں پیوند لگے سیاہ موزے پہنے، ہاتھ میں کافی اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس لیے میں وہیں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا...... لاجوردی، نقرئی کشیدہ کاری والی...... اور ارد گرد نظر دوڑائی۔ دیواروں پر رشتہ داروں اور فلمی ستاروں کی تصاویر آویزاں تھیں؛ کتابوں کی الماری جو واضح طور پر بیوی کی ملکیت تھی، اس میں متعدد سستے ناول اور فیشن میگزین موجود تھے۔ سائیڈ ٹیبل کے نیچے البموں کا ڈھیر تھا جن کی مہمان اوراق گردانی کرتے رہے ہوں گے۔ نہ جانتے ہوئے کہ اب میں کیا کروں، میں نے ان میں ایک البم اٹھالی لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے کھولتا، حامدی دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے گیلے بالوں کو سنوار رہا تھا جبکہ دوسرے سے اپنی قمیص کے بٹن بند کر رہا تھا۔

''تو اب......'' اُس نے کہا، ''مجھے اپنے تازہ ترین حالات بتاؤ۔''

''کہنے کو اور کچھ نہیں، واقعی، سوائے اس کے جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

مجھے یوں اتفاقیہ مل کر وہ خوش دکھائی دیتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس سے اسے موقع مل گیا تھا کہ وہ مجھے دکھا سکے کہ وہ کس قدر کامیاب تھا، یا پھر اسے مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ مجھ جیسا نہیں تھا۔ جب بدقسمتی ان لوگوں کو اپنا شکار بناتی ہے جو کبھی ہمارے ہمراہ تھے، ہمیں ذرا سکون محسوس

ہوتا ہے، تقریباً یوں جیسے ہمارا خیال ہو کہ ہم خود اس بد قسمتی سے بچ گئے ہیں، اور جب ہم خود کو یقین دلاتے ہیں کہ دوسرے ہماری جگہ مصیبت میں گرفتار ہیں تو پھر ہم ان مصیبت زدگان کے لیے ترحم محسوس کرتے ہیں۔ کم وبیش یہی لب ولہجہ حامدی نے یہ پوچھتے ہوئے اختیار کیا، ''کیا تم اب بھی لکھتے ہو؟''

''کبھی کبھار...... کچھ شاعری، کچھ کہانیاں......''

''لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس قسم کی چیزوں سے کوئی فائدہ بھی ہوا ہے؟''

میں دوبارہ ہنس پڑا۔ اس پر وہ کہنے لگا، ''میرے دوست، تمہیں اب واقعی رکنا چاہیے!'' اور پھر وہ مجھے نصیحتیں کرنے لگا کہ اگر میں کامیاب ہونا چاہتا ہوں، تو مجھے کیسے اب عملی ہونا پڑے گا اور پھر یہ کہ سکول کے ایام کے خاتمے کے بعد ادب جیسی کھوکھلی جستجو محض نقصان کے اور کچھ نہیں دے سکتی۔ اس نے مجھ سے یوں بات کی جیسے میں کوئی بچہ ہوں اور بغیر یہ خیال کیے کہ جواب میں کہنے کو میرے پاس بھی کچھ ہو سکتا تھا، بلاشبہ جواب میں کوئی بحث کرنے کو، اور وہ واضح طور پر یہ کہنے سے ذرا نہ جھجکا کہ یہ کامیابی ہی تھی جس نے اسے حوصلہ بخشا۔ اس دوران میں محض وہاں بیٹھا رہا اور اپنے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ لیے جو مجھے یقین تھا کہ مجھے بالکل احمق دکھا رہی ہو گی، اور جس نے محض اس کے اعتماد میں مزید اضافہ ہی کیا۔

''کل صبح مجھ سے ملاقات کرو!'' اب اس نے کہا، ''ہم دیکھیں گے کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ذہانت تم میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہے۔ تم قدرے ست بھی ہو، لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں۔ تجربہ بہترین استاد ہے!...... اب بھولنا مت۔ جلدی پہنچ جانا۔''

لگتا تھا کہ جیسے وہ بھول چکا ہو کہ وہ خود سکول کے ست ترین لڑکوں میں سے ایک تھا۔ یا پھر یہ سمجھتے ہوئے رعایت کے رہا تھا کہ میں فی الحال اس کی کوئی بات رد نہیں کروں گا۔

جب وہ کرسی سے اٹھنے لگا، میں اچھل کر کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''اگر تم اب مجھے اجازت دو۔'' میں نے کہا۔

''اس قدر جلدی کیوں، میرے دوست؟ اوہ خیر، تم بہتر جانتے ہو۔''

عین اس وقت مجھے یاد آیا کہ اس نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ لیکن معلوم

ہوتا تھا کہ یہ بات اس کے ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اپنا ہیٹ لیتے ہوئے، میں نے کہا، ''برائے کرم، اپنی بیوی کو میرا آداب کہہ دینا۔''

''اوہ، میں کہہ دوں گا، کہہ دوں گا۔ اور کل صبح مجھ سے ملاقات کے لیے آنا مت بھولنا! اس دوران شکستہ دل مت ہونا!'' یہ کہتے ہوئے اس نے میری کمر پر تھپکی دی۔

جس وقت میں اس کے گھر سے رخصت ہوا، تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ سٹریٹ لیمپس روشن تھے۔ میں نے گہری سانس بھری۔ فضا میں گرد و غبار موجود تھا لیکن حیران کن طور پر مجھے فضا بہت صاف و شفاف اور پُرسکون محسوس ہوئی۔ میں پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگلی صبح میں حامدی کے دفتر پہنچ گیا...... حالاں کہ گزشتہ شام اس کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں تھا۔ آخر کو اس نے مجھے کوئی ٹھوس پیشکش نہیں کی تھی۔ جس کسی سے میں نے مدد طلب کی، اس نے مجھے یہی فرسودہ الفاظ کہہ کر رخصت کر دیا: ''دیکھتے ہیں کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' بہرحال، میں حامدی کے دفتر پہنچ گیا۔ مجھے ایسا کرنے پر کسی امید نے نہیں بلکہ اپنی بے عزتی دیکھنے کی خواہش نے اکسایا تھا۔ میں خود سے کہہ رہا تھا: ''گزشتہ رات تم وہاں خاموش بیٹھے رہے اور اُسے کسی سرپرست جیسا سلوک کرنے دیا، ہے ناں؟ خوب، تم اب اس کا تلخ انجام بھی دیکھو جس کے تم بجا طور پر مستحق ہو۔''

دربان پہلے مجھے ایک چھوٹی سی انتظار گاہ میں لے گیا۔ جب مجھے حامدی کے دفتر میں بلایا گیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے ہونٹوں پر وہی احمقانہ مسکراہٹ تھی اور مجھے اس لمحہ خود سے بے حد نفرت محسوس ہوئی۔

اس وقت حامدی اپنے سامنے میز پر موجود کاغذوں کے پلندے میں انتہائی منہمک تھا جبکہ مینیجروں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ اس نے اپنے سر کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا کہا، اس سے ہاتھ ملانے کا حوصلہ نہ پاتے ہوئے، میں بیٹھ گیا۔ میرا اعتماد اتنا گر چکا تھا کہ میں نے خود کو مخبوط الحواس محسوس کیا، یوں جیسے وہ واقعی میرا باس ہو، جو مجھے میری اوقات یاد دلا رہا ہو اور اسی دوران میں نے اس سلوک کو محض معمول سمجھ کر قبول کر لیا۔ محض بارہ گھنٹے میں، جب سے میرے اس پرانے ہم جماعت نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا، ہمارے بیچ کیسی خلیج پیدا ہو چکی تھی! کس قدر بے سروپا

تھے، وہ کھیل جو ہم نے دوستی کے نام پر کھیلے، کیا اس قسم کی ایک دوسرے پر فوقیت کی کھو کھلی مصنوعی دوڑ کا کسی حقیقت سے کوئی تعلق تھا؟

گزشتہ شام سے حامدی یا میرے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں وہی تھے، جو تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے متعلق چند باتیں دریافت کر لینے کے بعد، ہم نے ان معمولی تفصیلات کو ہمیں الگ راستے اپنانے کی اجازت سمجھا۔ عجیب ترین بات یہ تھی کہ ہم دونوں نے اپنے تعلقات میں اس تبدیلی قبول کر لیا تھا، اور حتیٰ کہ اسے فطری سمجھ لیا تھا۔ مجھے اس یا خود پر غصہ نہ آیا۔ اب میں محض وہاں رکنا نہ چاہتا تھا۔

''میں نے تمہارے لیے ایک ملازمت ڈھونڈ لی ہے!'' اس نے جیسے اعلان کیا۔ اپنی بے خوف اور مخلص آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھتے اس نے مزید کہا، ''میرا مطلب ہے، میں نے ایک ملازمت تخلیق کی ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ تمہیں صرف یہی کرنا ہوگا کہ مختلف بینکوں، خاص طور پر ہمارے اپنے بینک کے ساتھ ہمارے معاملات کی نگرانی کرو...... تمہارا کام ایک رابطہ کلرک جیسا ہوگا کہ بینک کے ساتھ ہماری فرم کے معاملات میں معاونت کرو...... اور جب تم اس ذمہ داری سے فارغ ہو تو تم اپنے 'کام' کی طرف توجہ مرکوز کر سکتے ہو...... جتنی چاہے نظمیں لکھو...... میں نے ڈائریکٹر سے بات کر لی ہے اور ہم تمہیں اپنی فرم میں ملازمت دینے کے لیے تیار ہیں...... سوائے اس کے کہ فی الحال ہم تمہیں چالیس یا پچاس لیرا سے زیادہ نہیں دے سکیں گے۔ بلاشبہ بعد میں ہم تمہاری تنخواہ بڑھا دیں گے۔ اس لیے کام شروع کر دو! کامیابی ہماری منتظر ہے!''

کھڑے ہونے کی زحمت گوارا کیے بغیر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے بھی یہی کیا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے چہرے پر میں دیکھ سکتا تھا کہ میری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہونے پر وہ کس قدر خوش تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ وہ دراصل برا آدمی نہیں...... اس نے یہ طرزِ عمل اپنے مقام کے مطابق اپنایا اور شاید یہ واقعی ضروری تھا۔ لیکن اس کے دفتر سے نکلنے کے بعد ایک لمحہ تھا، جب میں اس جگہ سے فوراً نکلنے کی بجائے اُس کے بتائے گئے کمرے کی طرف بڑھنے پر زیادہ آمادہ نہ تھا۔ لیکن بالآخر میں سر جھکائے راہداری میں پہنچ گیا اور دکھائی دینے والے پہلے دربان سے راعف آفندی کے دفتر کا راستہ پوچھا۔ اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ

کیااور آگے بڑھ گیا۔ میں دوبارہ رک گیا۔ میں یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا؟ یا کیا میں چالیس لیرا کی تنخواہ سے دستبردار ہونے کے ناقابل تھا؟ یا پھر شاید میں حامدی کو ناراض کرنے سے گھبراتا تھا؟ نہیں! میں اب مہینوں سے بے روزگار تھا۔ میں اس جگہ سے بغیر کسی مستقبل کے امکان کے رخصت ہو جاتا اور نہیں معلوم کہ میں جاتا کہاں......اور اپنی تمام تر ہمت سے محروم ہو جاتا۔ یہ وہ خیالات تھے جنہوں نے مجھے اس نیم تاریک راہداری میں اس دربان کا منتظر رکھا کہ میری رہنمائی کرے۔

آخر میں نے یونہی ایک دروازے سے جھانکا اور مجھے راعف آفندی دکھائی دے گیا۔ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس کے باوجود، جب میں نے اس شخص کو اپنی میز پر جھکے دیکھا تو میں جان گیا کہ یہی وہ شخص ہوگا۔ بعدازاں، میں حیران ہوا کہ میں نے یہ نتیجہ کس طرح اخذ کیا تھا۔ حامدی نے کہا تھا،''میں نے اپنے جرمن مترجم راعف آفندی کے دفتر مین تمہارے لیے میز کا انتظام کیا ہے۔ وہ ایک سادہ انسان ہے اور بہت کم گو بھی ہے۔ ہر طرح سے بے ضرر۔'' اس وقت جب ہر شخص کو صاحب اور صاحبہ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا، اسے ابھی تک راعف آفندی ہی پکارا جاتا تھا۔ شاید اس بیان سے ذہن میں بننے والی تصویر تھی، جس نے مجھے بتایا کہ یہ سفید بالوں، بڑھی ڈاڑھی والا شخص جس نے کچھوے کے خول کا چشمہ لگایا ہوا تھا، وہی ہوگا۔ میں اندر چلا گیا۔

اس نے اپنی جاگتے میں خواب دیکھتی آنکھوں سے مجھے دیکھنے کو سر اٹھایا، جس پر میں نے کہا:''آپ راعف آفندی ہی ہیں۔''

ایک لمحے کو اس نے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ پھر نرم بلکہ تقریباً خوف زدہ آواز میں اُس نے کہا:''ہاں، اور تم یقیناً نئے کلرک ہو۔ وہ ابھی تمہاری میز لگانے کے لیے آئے تھے۔ خوش آمدید! آؤ، اندر آجاؤ!''

میں نے اپنی نشست سنبھال لی۔ میں نے اپنی میز پر خراشوں کے نشانات اور روشنائی کے مدھم داغوں کا جائزہ لیا۔ اس وقت میری خواہش یہ تھی، جیسا کہ عموماً ہوتا ہے کہ جب آپ کسی اجنبی سامنے بیٹھے ہوں، میں اس کا پہلا......اور یقیناً غلط......تاثر بنانے کی خاطر کنکھیوں سے اسے دیکھتے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ایسی کوئی خواہش اس کے دل میں نہیں

تھی، وہ بدستور سر جھکائے اپنے کام میں مگن تھا، یوں جیسے میں وہاں موجود نہ تھا۔
دوپہر تک ایسا ہی رہا۔ اب میں کھلے عام، بغیر کسی خوف کے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے بال چھوٹے چھوٹے تھے اور وہ درمیان سے گنجا ہو رہا تھا۔ اس کی گردن اور چھوٹے چھوٹے کانوں کی درمیانی جلد پر جھریاں تھیں۔ جب وہ بغیر کسی بے صبری کے اطمینان سے ترجمے کے کام میں مصروف تھا، اس کی لمبی اور پتلی انگلیاں ایک سے دوسری دستاویز پر منڈلا رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے وہ اپنی نگاہیں اٹھاتا، یوں جیسے وہ درست الفاظ کے انتخاب میں ہو اور جب ہماری نظریں ملتیں، وہ مجھے مسکراہٹ سے مشابہ کچھ پیش کرتا۔ اگرچہ ایک طرف یا اوپر سے دیکھنے پر وہ ایک ادھیڑ عمر شخص لگتا تھا لیکن جب وہ مسکراتا تو دل موہ لینے والے کسی بچے کی طرح معصوم دکھائی دیتا۔ جبکہ اس کی منڈی ہوئی مونچھیں اس تاثر میں مزید اضافہ کرتی تھیں۔

جب میں کھانا کھانے کے لیے باہر جا رہا تھا تو میں نے اسے میز کی دراز کھول کر کھانے کا برتن اور کاغذ میں لپٹی روٹی نکالتے دیکھا۔ ''Bon Appetit'' میں یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔

کئی طویل روز تک ایک ہی کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھنے کے باوجود ہمارے درمیان بہت کم بات چیت ہوئی۔ اس وقت تک میری دوسرے شعبوں کے کچھ کلرکوں سے اتنی واقفیت ہو چکی تھی کہ میں شام کو ان کے ہمراہ کافی خانے جا کر پانسے کھیلتا تھا۔ ان ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ راعف آفندی اس فرم کے سب سے پرانے کلرکوں میں سے ایک تھا۔ اس فرم کے قیام سے قبل، وہ اس بینک میں بطور مترجم کام کرتا تھا جسے فرم اب استعمال کرتی تھی۔ کسی کو یاد نہ تھا کہ اس نے کب ملازمت شروع کی۔ کہا جاتا تھا کہ اسے ایک بڑے کنبے کی نگہداشت کرنی پڑتی تھی اور اس کی تنخواہ میں محض گزر بسر ہی ہوتی تھی۔ جب میں نے پوچھا کہ فرم نے یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ کس قدر سینئر تھا، اس کی تنخواہ کیوں نہیں بڑھائی، اور ایک ایسی فرم جو دائیں بائیں رقم اچھالتی پھرتی تھی تو نوجوان کلرک ہنس پڑے۔ ''اس لیے کہ وہ ایک مضمحل سا آدمی ہے! ہمیں یہ بھی یقین نہیں کہ حقیقتاً وہ زبان دانی میں کتنا اچھا ہے!'' اگرچہ بعدازاں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کی جرمن بہت ہی شاندار تھی اور اس کے تراجم، انتہائی درست اور خوش اسلوب تھے۔ وہ لکڑی کاٹنے کی

مشین یا فاضل پرزہ جات سے متعلق خطوط، یا پھر یوگوسلاویہ کی سوسک بندرگاہ سے بھجوائی گئی جلانے کی یا تعمیراتی لکڑی کی خصوصیات کے متعلق خطوط یکساں آسانی سے ترجمہ کرسکتا تھا۔ جب وہ ترک زبان سے معاہدات یا تفصیلات کا جرمن زبان میں ترجمہ کرتا تو ڈائریکٹر انہیں بلاپس وپیش آگے بھیج دیتا۔ اپنے فارغ اوقات میں وہ اپنا دراز کھولتا اور وہاں رکھی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا، وہ اس ضمن میں کبھی عجلت کا مظاہرہ نہ کرتا اور نہ ہی اس کتاب کو دراز سے نکال کر کہیں دوسری جگہ رکھتا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھ لیا، ''راعف بے، یہ کیا ہے؟'' اس کا چہرہ یوں سرخ ہوگیا کہ جیسے میں نے اسے کوئی غلط کام کرتے رنگے ہاتھوں پکڑلیا ہو، اور اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا، '' کچھ نہیں......بس ایک جرمن ناول ہے!'' اس نے دراز فوراً بند کردی۔ اس سب کے باوجود اس فرم کا کوئی بھی شخص ایک غیر ملکی زبان میں اس کی مہارت پر اس کی تعریف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اور شاید بلاسبب نہیں، اس شخص کے متعلق نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ جانتا ہوگا۔ اس کے ہونٹوں سے کبھی کوئی غیر ملکی لفظ ادا نہ ہوتا تھا۔ اس نے کبھی بات نہیں کی کہ وہ غیر ملکی زبانیں جانتا تھا، کبھی اپنے ہمراہ غیر ملکی میگزین یا اخبارات نہ رکھتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ کسی ایسے شخص سے کوئی مشابہت نہ رکھتا تھا جس کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہو کہ وہ تمام دنیا کو بتاتا پھرے کہ وہ فرانسیسی سمجھتا ہے۔ یہ حقیقت اس بات سے مزید واضح ہوتی تھی کہ اس نے اپنی تنخواہ میں اضافے کے مطالبے کے ذریعے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کبھی نہ کی۔ نہ ہی اس نے کبھی کوئی دوسری بہتر تنخواہ کی ملازمت کے حصول کی کوشش کی۔

وہ پابندی سے وقت پر دفتر پہنچتا، اپنے کمرے میں ہی دوپہر کا کھانا کھاتا، اور شام کو وہ دکان سے کچھ چیزیں لیتا اور گھر روانہ ہوجاتا۔ میں نے چند ایک مرتبہ اسے کافی خانے چلنے کی دعوت دی لیکن میں اسے یہاں آنے پر مجبور نہ کرسکا۔ ''وہ گھر پر میرے منتظر ہیں!'' وہ کہتا۔ یعنی وہ ایک خوش باش گھریلو شخص تھا، میں نے سوچا، جسے اپنے بیوی بچوں کے پاس جانے کی جلدی ہوتی۔ بعد میں وقت کے ساتھ مجھے معلوم ہوتا کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ طویل برسوں کی محنت ومشقت کے باوجود، دفتر میں اسے اسی طرح ناپسند کیا جاتا تھا۔ اگر ہمارا دوست حامدی، راعف آفندی کے ترجے میں ٹائپنگ کی ذرا سی بھی غلطی تلاش کرلیتا تو وہ اس بے چارے کو فوراً طلب کرلیتا اور

بعض اوقات تو وہ اس کی سرزنش کے لیے ہمارے کمرے میں چلا آتا۔ دفتر کے دوسرے کارکنوں کے ساتھ وہ ہمیشہ محتاط رویہ اپناتا، یہ جانتے ہوئے کہ ان میں سے ہر ایک کی ملازمت ان کے خاندانی تعلقات کی مرہون منت تھی، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی پریشانی کھڑی کرے۔ اگر وہ اپنا چہرہ سرخ کر لیتا اور آفندی کے سامنے اس قدر بلند آواز سے بولتا کہ سارا دفتر سنتا کہ ترجمہ میں چند گھنٹے تاخیر ہوئی تھی، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے علم تھا کہ اس میں اس کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں...... یہ جاننا بہت آسان تھا۔ کیا اپنے جیسے کسی انسان پر طاقت و اختیار کے مظاہرے سے زیادہ بڑی سرشاری کوئی ہو سکتی ہے؟ تاہم، اگر دیکھا جائے تو ایسی سرشاری کبھی کبھار ہی ملتی ہے اور کسی خاص قسم کے شخص کے حوالے سے ہی اس سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

کبھی کبھار راعف آفندی بیمار ہو جاتا اور دفتر سے غیر حاضر ہوتا۔ زیادہ تر اس کی وجہ عام نزلہ زکام ہوتا جس کی وجہ سے وہ گھر پر ہی رہتا۔ لیکن بہت پہلے پھیپھڑوں کی اندرونی سوزش میں مبتلا ہونے کے باعث وہ بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ اگر اسے معمولی سی چھینک بھی آ جاتی، وہ فوراً گھر میں بند ہو کر بیٹھ جاتا اور جب واپس آتا تو اس نے کئی قسم کے گرم کپڑے پہنے ہوتے۔ وہ اصرار کرتا کہ ہمارے دفتر کی تمام کھڑکیاں بند رکھی جائیں اور جب شام ہوتی تو وہ دو تین مفلر اپنی گردن اور کانوں کے گرد لپیٹ لیتا، دفتر سے باہر نکلتے ہوئے اپنے موٹے پھٹے پرانے کوٹ کا کالر جتنا ہو سکتا، اونچا کر لیتا۔ لیکن بیماری کے دوران بھی وہ اپنے کام سے غافل نہ رہتا۔ ایک پیغام رساں اسے گھر پر ترجمے کا مطلوبہ کام دے جاتا اور چند گھنٹے بعد لے جاتا۔ پھر بھی حامدی اور ڈائریکٹر اس سے مخاطب ہوتے تو وہ یہ کہتے ہوئے محسوس ہوتے: ''او، روتے بسورتے بچے، مت بھولو ہم نے تم پر کس قدر ترس کھایا ہے! تم چاہے جتنی مرتبہ بھی بیمار پڑے ہو، ہم نے تمھیں پھر بھی ملازم رکھا ہوا ہے!'' وہ کبھی بھی یہ اس کے منہ پر کہنے سے باز نہ آتے: اگر وہ بے چارہ بہت دن کی غیر حاضری کے بعد واپس آتا تو حامدی اور اس کا ڈائریکٹر اس کا حال احوال دریافت کرنے کی بجائے تلخ و ترش جملے اس کے منہ پر مارتے: ''کیسی گزر رہی ہے؟ بالآخر تم نے یہ رویہ چھوڑ ہی دیا ہے، مجھے امید ہے!''

اس دوران، راعف آفندی کے ساتھ میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہونے لگا۔ میں دفتر

میں زیادہ وقت صرف نہیں کرتا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت دستاویزات کا بیگ اٹھائے ایک سے دوسرے بینک یا مختلف حکومتی وزارتوں میں گھومتے گزرتا تھا جن کے احکامات ہم لیتے تھے، ڈائریکٹر یا اس کے معاون کے پاس جانے سے پہلے میں ان دستاویزات کو ترتیب دینے یا ان کے مطالعے کی خاطر کبھی کبھار ہی اپنی میز پر آتا۔ لیکن پھر بھی میں اس تھکے ماندے شخص کو دیکھ کر مایوس ہونے لگا تھا جو میرے سامنے بے روح انداز میں بیٹھے، مسلسل ترجمہ کیے جاتا تھا، سوائے اس وقت کے جب وہ اپنی دراز میں رکھا جرمن ناول نکال کر پڑھتا۔ میرے خیال میں وہ اس قدر بزدل تھا کہ اپنی روح کو بھی دریافت کرنے سے خائف تھا کجا کہ اسے بیان کر سکے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بس کسی پودے جتنا ہی جاندار تھا۔ ہر صبح وہ کسی مشین کی طرح چلنا شروع ہوتا اور اپنا کام کرتا، اور بے وجہ احتیاط سے محض اپنی کتابیں پڑھنے کو ہی رکتا تھا اور پھر وہ دفتر سے رخصت ہونے کے بعد دکان سے چند اشیا خرید کر گھر روانہ ہو جاتا۔ جہاں تک میں نے دیکھا تھا کہ گزشتہ کئی برسوں میں اس کے اس بے کیف معمول میں صرف اس کی بیماری کے دوران ہی خلل آتا تھا۔ میرے نئے دوستوں کے مطابق، کسی کو یاد بھی نہ تھا کہ وہ کب سے یونہی جیے جا رہا تھا۔ اسے کسی نے بھی کسی چیز کے متعلق پُرجوش ہوتے نہ دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ بے بنیاد اور بے سبب الزامات کا سامنا کرتے بھی، وہ اپنے افسران کو وہی سپاٹ اور پُرسکون تاثر دیتا؛ جب وہ سیکریٹری کو ترجمہ ٹائپ کرنے کے لیے دیتا اور بعد میں جب اس کا شکریہ ادا کرتا، اس کے ہونٹوں پر وہی احمقانہ مسکراہٹ ہوتی۔

ایک روز ایک اور ترجمے میں تاخیر ہوئی کیوں کہ ٹائپسٹ نے اس کے کام کو زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ جب حامدی ہمارے کمرے میں آیا، وہ درشت دکھائی دیتا تھا: ''ہمیں مزید کتنا انتظار کرنا ہوگا؟ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ یہ کام فوری کرنا ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ میں جانے والا ہوں۔ لیکن تم نے ابھی تک ہنگری کی فرم کے خط کا ترجمہ نہیں کیا!''

راعف آفندی پھرتی سے کرسی سے اٹھا اور بولا: ''جناب، میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں! خواتین کو اسے ٹائپ کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ انہیں دوسرے کام دیئے گئے ہیں!''

''کیا تم نے انہیں بتایا نہیں کہ یہ خط ضروری اور فوری نوعیت کا ہے؟''

''جی ہاں جناب، میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا!''

ایک دفعہ پھر حامدی نے اپنی آواز بلند کی: ''مجھے جواب دینے کی بجائے اپنے کام پر توجہ دو!'' یہ کہہ کر وہ دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے چلا گیا۔

اس کے ساتھ ہی راعف آفندی بھی کمرے سے باہر نکل گیا تا کہ جا کر ٹائپسٹ کی منت سماجت کر سکے۔

اس دوران میں حامدی کے متعلق سوچنے لگا جس نے اپنے طرزِ عمل کے دوران مجھ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی بھی زحمت گوارانہ کی تھی۔ جلد ہی جرمن مترجم اپنی میز پر سر جھکا کر کام کرنے واپس کمرے میں آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے سکون واطمینان نے مجھے حیران اور مشتعل کر دیا۔ اس نے پنسل اٹھائی اور کاغذ پر جلدی جلدی کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ وہ لکھ نہیں رہا تھا بلکہ کچھ مصوری کر رہا تھا۔ لیکن کسی مشتعل شخص کے بے سوچے سمجھے انداز میں نہیں۔ میں اس کی سنہری مونچھوں تلے اور ہونٹوں کے گوشوں پر ایک پُراعتماد مسکراہٹ دیکھ سکتا تھا۔ اس کا ہاتھ کاغذ پر پھرتی سے حرکت کر رہا تھا۔ اس دوران وہ غور سے دیکھنے کو اپنی آنکھیں قدرے سکیڑتا رہا۔ میں اس کی پُراعتماد مسکراہٹ سے جانتا تھا کہ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ اس سے بہت خوش تھا۔ بالآخر اس نے اسے مزید غور سے دیکھنے کو پنسل نیچے رکھی جب کہ میں ڈھیٹ بن کر اسے بدستور گھورے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ تاثرات تھے جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ تاثرات جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی انسان کسی دوسرے کے لیے دُکھ محسوس کرے۔ میری حیرانی نے مجھے متجسس کر دیا۔ میں اپنی کرسی پر ٹک نہ سکا۔ جیسے ہی میں اٹھنے لگا، وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور دوبارہ ٹائپسٹ کی تلاش میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک ہی جست میں، میں اس کی میز کے پاس پہنچ چکا تھا، میں نے وہ کاغذ اٹھایا۔ تبھی میں ہکا بکا ہو کر اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

وہاں ہتھیلی جتنا بڑا حامدی کا خاکہ تھا۔ چند ماہرانہ لکیروں میں اس نے اس شخص کی حقیقت کو مجسم کر دیا تھا۔ شاید، کسی اور کو اس میں کوئی مشابہت نظر نہ آتی، شاید ایک ایک لکیر دیکھتے ہوئے یہ مشابہت کہیں کھو جاتی لیکن کوئی شخص جس نے ابھی حامدی کو اس کمرے میں دھاڑتے اور چنگھاڑتے سنا تھا، اسے مشابہت تلاش کرنے میں کوئی غلطی نہ ہوتی۔ اس کا لمبوترا اور بے ہودہ منہ ناقابل بیان انداز میں حیوانی غصے میں غرّا رہا تھا۔ آنکھوں میں...... دو لکیریں...... میں مَیں اپنے

اشتعال کا سبب شخص کو چھید دینے کی خواہش اور ایسا نہ کر پانے پر مایوسی کا تاثر بھی دیکھ سکتا تھا۔ ناک، جو چپٹی نظر آ رہی تھی، اسے دیکھنے میں مزید بے رحم بنا رہی تھی...... ہاں، یہی تھا وہ شخص جو چند لمحے پہلے اس کمرے میں طوفان کی مانند آیا تھا، یا بلکہ یہی اس کی روح تھی۔ لیکن جس چیز نے مجھے حیرت زدہ کیا، وہ یہ نہ تھی۔ مہینوں پہلے اس فرم میں آنے کے وقت سے، میں نے حامدی کے متعلق کئی اندازے لگائے تھے۔ بعض اوقات، میں نے اس کے لیے خود ہی عذر تراشنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن زیادہ تر میں اس کے متعلق برا ہی سوچتا رہا تھا۔ اس اہم شخصیت میں اپنے پرانے دوست کو تلاش کرنے میں مَیں ناکام رہا جو نہ اہم تھا نہ اس کی کوئی شخصیت تھی۔ لیکن اس وقت راعف آفندی نے اسے ان چند لکیروں میں مجسم کر دیا تھا اور میں حامدی کو پہلے کی طرح نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے وحشی اور قدیم تاثرات کے باوجود، اس میں ایک قسم کی بے چارگی کا عنصر بھی موجود تھا۔ میں نے بے رحمی اور بے چارگی کے درمیان ایسی واضح کھچی ہوئی لکیریں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ یوں تھا کہ جیسے میں اپنے دوست کو گزشتہ دس برس میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

عین اسی لمحے، ایک ہی جھماکے میں، مجھے اس خاکے نے راعف آفندی کے متعلق سب کچھ سمجھا دیا۔ اب میں اس کی غیر متزلزل متانت اور تعلق بنانے میں ہچکچاہٹ کو سمجھ سکتا تھا۔ اپنے گردونواح کے ماحول سے اس قدر شناسا اور دوسروں کے متعلق مشاہدے میں اس قدر تیز اور درست شخص کس طرح غصے یا جوش وخروش کا خوگر ہو سکتا تھا؟ ایسے شخص کے پاس تنگ نظر اور متعصبانہ حملوں کے جواب میں چٹان کی مانند کھڑا ہونے کے علاوہ کیا انتخاب تھا؟ ہماری خواہشیں، ہماری مایوسیاں اور ہمارے غصے کے دورے...... جن کے سامنے ہم تب ہتھیار ڈال دیتے ہیں جب کوئی غیر متوقع صورتِ حال یا ایسا واقعہ ہمیں پیش آئے، کوئی ایسی بات جس کی کوئی تُک نہیں ہوتی۔ کیا کسی ایسے شخص کو کوئی صدمہ پہنچانا ممکن ہے جو کسی بھی صورتِ حال کے لیے تیار ہو، اور جسے واضح طور پر معلوم ہو کہ کسی بھی دوسرے شخص سے اسے کیا توقع رکھنی چاہیے؟

اس کے باوجود راعف آفندی میں کوئی ایک ایسی بات تھی جو مجھے اب بھی پریشان کر رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں بہت سی ایسی متضاد باتیں تھیں جن کا اظہار اس خاکے سے نہیں ہو رہا تھا۔ اس خاکے کو کسی ماہر مصور کی نفاست سے بنایا گیا تھا۔ یہ برسوں کی مشق کا منہ بولتا

ثبوت تھا۔ اس میں اشیا کے جوہر کو سمجھنے والی حساس اور ماہر آنکھ سے بڑھ کر کچھ تھا۔ وہ ایک مشاق ہاتھ تھا جو اس روح اس جوہر کو ایک نفیس اور شان دار انداز میں خاکے میں سمو سکتا تھا۔

دروازہ دوبارہ کھلا۔ میں نے اس خاکے کو دوبارہ میز پر رکھنا چاہا لیکن مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ جیسے ہی راعف آفندی، ہنگری کی فرم کے خط کا ترجمہ لیے کمرے میں داخل ہوا، میں نے اس سے معذرت طلب کی: ''یہ خاکہ بہت خوب ہے۔''

میرا خیال تھا کہ وہ حیران ہوگا اور فکر مند کہ شاید میں اس کا راز فاش کر دوں گا۔ ایسا کچھ نہ ہوا۔ حسب معمول اپنی مبہم اور اجنبی مسکراہٹ کے ساتھ، اس نے خاکہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

''بہت برس پہلے کسی زمانے میں مجھے مصوری سے دلچسپی تھی۔'' اس نے مجھے بتایا، ''کبھی کبھار میں مصوری کیا کرتا تھا تاکہ...... اس قسم کے احمقانہ کاموں میں...... میرا ہاتھ سیدھا رہے...... محض وقت گزاری کو......''

اس نے خاکے کو توڑ مروڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

''سیکریٹری نے اسے بہت تیزی سے ٹائپ کیا ہے۔'' وہ بڑبڑایا، ''ممکن ہے کہ اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں، لیکن اگر میں اسے ابھی پڑھنے بیٹھ گیا تو پھر حامدی مزید غصہ کرے گا...... اور وہ اس میں حق بجانب ہوگا...... بہتر ہوگا کہ میں اسے اب اس کے پاس لے جاؤں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میری نگاہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ ''اور وہ اس میں حق بجانب ہوگا۔'' میں زیرِ لب دہرا رہا تھا، ''وہ اس میں حق بجانب ہوگا۔''

اس روز کے بعد سے راعف آفندی جو کچھ بھی کرتا، میں اس میں بہت دلچسپی لینے لگا، چاہے وہ کام کس قدر ہی معمولی یا فضول ہوتا۔ اس کی حقیقی شناخت سے باخبر ہونے کے اشتیاق میں، میں اس سے بات کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اس نے رویے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ بھانپ گیا تھا کہ میں اب پہلے سے کہیں زیادہ ملنسار ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ بااخلاق تھا لیکن اس نے مجھ سے بدستور فاصلہ قائم رکھا۔ ظاہری طور پر ہم دوست نظر آتے تھے، لیکن اس نے اپنی ذات کو مجھ پر کبھی منکشف نہیں کیا۔ خصوصاً جب سے میں اس کے گھرانے سے ملا تھا اور میں خود

دیکھ چکا تھا کہ خاندان کی کون سی ذمہ داریاں اس کی کندھوں پر ہیں، میں اس کے متعلق مزید متجسس ہو گیا۔ جتنا میں اُس کے قریب ہوا، اتنے ہی معمے میری راہ میں حائل ہوئے۔

وہ اس کی معمول کی بیماری کا زمانہ تھا جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا۔ حامدی ایک ملازم کو ایک ایسے خط کے ساتھ اس کے گھر بھجوانے والا تھا جس کا ترجمہ اگلے دن مطلوب تھا۔

''یہ مجھے دے دو۔'' میں نے کہا،''یوں میں اس کا حال احوال بھی پوچھ سکوں گا۔''

''بہت خوب...... جب تم وہاں جاؤ تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ اسے کیا بیماری ہے۔ اس دفعہ تو وہ واقعی بہت دن سے غیر حاضر ہے!''

درحقیقت، اس بار اس کی بیماری کا وقفہ بہت طویل تھا اور وہ ایک ہفتہ سے زیادہ عرصے دفتر نہیں آ سکا تھا۔ ایک ملازم نے مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دیا جو عصمت پاشا نامی محلہ میں واقع تھا۔ موسم سرما کا وسط تھا۔ رات کی پھیلتی تاریکی میں مَیں تنگ گلیوں سے گزرتا چلا گیا، جن کے ٹوٹے فٹ پاتھ انقرہ کی اسفالٹ شاہراہوں سے قرنوں کی دوری پر لگتے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا پہاڑ اور دوسری وادی تھی۔ کافی دیر پیدل سفر کے بعد، جب مجھے لگا میں شہر کے دوسرے کنارے پہنچ چکا تھا، میں بائیں سمت مڑ گیا۔ موڑ پر ایک کافی خانے سے میں نے زرد، دومنزلہ مکان کا راستہ پوچھا جو پتھروں اور ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں میں تنہا کھڑا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ راعف آفندی نچلی منزل پر رہتا تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ ایک لڑکی، جس کی عمر بارہ سال معلوم ہوتی تھی، دروازے پر نمودار ہوئی۔ جب میں نے اس کے والد کے متعلق استفسار کیا تو اس لڑکی نے تھیٹر کے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر دانت پیسے۔

''اندر آجائیں۔'' وہ بولی۔

گھر کا اندرونی منظر میری توقعات سے قدرے برعکس تھا۔ راہداری جسے اب شاید کمرۂ طعام بنایا جا چکا تھا، میں ایک بڑی سی میز پڑی تھی۔ اس کے ایک طرف شیشے کی ایک الماری تھی جو بلوریں برتنوں سے بھری ہوئی تھی۔ فرش پر سیواس کا نفیس قالین تھا۔ باورچی خانے سے کھانے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ لڑکی مجھے بیٹھک میں لے گئی۔ یہاں بھی نفیس حتیٰ کہ مہنگا فرنیچر موجود تھا۔ سرخ مخملیں کرسیاں، دیوار سے لگے اخروٹ کی لکڑی کی چھوٹی میزیں اور ایک بہت بڑا ریڈیو۔ ہر

میز پر اور ہر کرسی کی پشت پر کریم رنگ کا جھالردار نفیس میز پوش تھا۔ دیوار پر بحری جہاز کی شکل کا ایک بہت بڑا تختہ آویزاں تھا جس پر دعا لکھی ہوئی تھی۔

چند ہی منٹ بعد لڑکی کافی لیے واپس آئی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک مضحکہ خیز اور بے ڈھنگی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ جب وہ دوبارہ پیالی لینے آئی تو اس نے کہا: ''جناب، میرے والد ٹھیک نہیں۔ وہ بستر سے باہر نہیں نکل سکتے۔ انہوں نے آپ کو اندر بلایا ہے۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے لگتا تھا جیسے وہ اپنی آنکھوں اور بھنوؤں سے مجھے کہہ رہی ہو کہ میں اس خوش اخلاقی کا مستحق نہیں تھا۔

میں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں راعف آفندی اپنے بستر پر دراز تھا...... یہاں مجھے ایک دفعہ پھر دھچکا لگا۔ وہ کمرا باقی گھر سے کسی طور بھی مشابہت نہ رکھتا تھا۔ وہ چھوٹا سا کمرا، کسی سکول کے ہاسٹل کا سونے کا مشترکہ کمرا یا پھر ہسپتال کا وارڈ معلوم ہو رہا تھا جہاں سفید بستر قطار میں لگے تھے۔ ان میں سے ایک پر عینک لگائے راعف آفندی بیٹھا تھا۔ اس نے میرے خیر مقدم کی کوشش کی۔ میں نے کرسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ جو دو کرسیاں مجھے نظر آئیں، ان پر اونی کپڑے، خواتین کے استعمال کے موزے اور ریشمی لباس بکھرے پڑے تھے۔ ایک طرف قرمزی رنگ کی الماری تھی جس میں نہایت بے ترتیبی سے سوٹ، لباس اور گٹھڑیاں ٹھونسے گئے تھے۔ اس کمرے کی ابتر حالت بہت پریشان کن تھی۔ پلنگ کے ساتھ موجود میز پر دھاتی طشت میں سوپ کا ایک پیالہ پڑا تھا جو بلاشبہ دوپہر کے کھانے کے وقت سے وہیں موجود تھا۔ اس میز پر ادویات کے انبار کے ساتھ ایک جگ، کچھ بوتلیں اور کچھ ٹیوبیں بھی تھیں۔

''میرے دوست، یہاں بیٹھ جاؤ۔'' اس نے بستر کے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ گیا۔ وہ کہنیوں پر سوراخوں والا ایک زنانہ سویٹر اوڑھے ہوئے تھا جبکہ اس کا سر پلنگ کے سفید دھاتی سرہانے پر ٹکا تھا۔ دوسرے کونے پر اس کے کپڑے لٹک رہے تھے۔

مجھے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتے پا کر گھر کا سربراہ یوں وضاحت کرنے پر مجبور ہو گیا: ''اس کمرے میں میرے ساتھ بچے بھی رہتے ہیں...... اور وہ بہت گند ڈالتے ہیں...... یہ چھوٹا سا

گھر ہے جس میں ہم بہ مشکل گزارا کرتے ہیں۔''

''کیا تمہارا کنبہ کافی بڑا ہے؟''

''خاصا بڑا! میری ایک بڑی بیٹی ہے جو اس وقت لائیسی میں پڑھ رہی ہے۔ تم نے میری دوسری بیٹی کو دیکھا ہی ہوگا۔ پھر میری سالی اور اس کا خاوند بھی ہے جبکہ میرے دو سالے بھی ہیں...... ہم سب یہاں اکٹھے رہتے ہیں۔ میری سالی کے دو بچے ہیں۔ ہم سب کو علم ہے کہ انقرہ میں مکان کی تلاش کس قدر مشکل ہے۔ اگر ہم الگ الگ رہتے تو کبھی بھی گزارا نہ ہو پاتا۔''

عین اس لمحے دروازے کی گھنٹی بجنے لگی اور اسی اثنا میں رونما ہنگامے سے میں نے اندازہ لگایا کہ گھر کے دوسرے افراد بھی آن پہنچے تھے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک لحیم شحیم خاتون جو چالیس کے پیٹے میں تھی اور جس کے چھوٹے چھوٹے بال اس پر چہرے پر آرہے تھے، سیدھی راعف آفندی کی طرف بڑھی اور اس کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتا، اس خاتون نے میری طرف اشارہ کیا۔

اس نے ہمارا تعارف کروایا۔ ''میرے دفتر کا ایک دوست۔'' اس نے پہلے کہا۔ اور پھر ''میری شریک حیات۔''

اپنی بیوی کی طرف مڑتے ہوئے وہ کہنے لگا، ''میری جیکٹ کی جیب سے نکال لو!''

اس دفعہ وہ خاتون بولنے کے لیے نہیں جھکی۔ ''میں رقم لینے نہیں آئی، خدا کا واسطہ! مصیبت یہ ہے کہ کون باہر جا کر روٹی لائے گا۔ تم تو ابھی بستر میں ہی ہو!''

''نورتن کو بھیج دو، چند ہی منٹ کا تو پیدل راستہ ہے۔''

''کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ رات اس کے پہر میں اس چھوٹی بچی کو دکان پر بھیجوں گی؟ باہر بہت سردی ہے۔ اس سے اہم بات یہ کہ وہ لڑکی ہے...... اور اگر میں اسے جانے کے لیے کہہ بھی دوں، تو تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا وہ میری بات سنے گی؟''

راعف آفندی نے چند لمحے سوچا اور پھر اس نے یوں اپنا سر ہلایا کہ جیسے اس کے ذہن میں کوئی حل آ گیا ہو۔ ''وہ جائے گی، وہ ضرور جائے گی!'' اس نے کہا۔ پھر وہ اپنی پرانی حالت پر واپس لوٹ آیا۔

اس خاتون کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ میری طرف مڑا اور کہنے لگا، ''اس گھر میں روٹی لانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ جب بھی میں بیمار ہوتا ہوں، روٹی لانے کے لیے انہیں کوئی دوسرا نہیں ملتا!''

اب نہایت ہی سعادت مندانہ انداز سے میں نے استفسار کیا، ''کیا تمہاری بیوی کے بھائی ابھی کم عمر ہیں؟''

اس نے میری طرف دیکھا لیکن جواب نہیں دیا۔ یوں تھا کہ جیسے اس نے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ لیکن چند منٹ بعد وہ کہنے لگا، ''نہیں، وہ کم عمر بالکل نہیں! وہ دونوں ملازمت کرتے ہیں۔ وہ ہماری طرح کلرک ہیں۔ ان کی بہن نے انہیں وزارت برائے معاشی امور میں بھرتی کروا دیا ہے۔ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی، حتیٰ کہ مڈل سکول ڈپلومہ بھی حاصل نہیں کر سکے!''

اپنی بات مختصر کرتے ہوئے اس نے پوچھا: ''کیا تم ترجمہ کے لیے کچھ لائے ہو؟''

''ہاں، یہ ترجمہ انہیں کل چاہیے۔ ایک ملازم کل صبح یہ ترجمہ لے جائے گا۔''

اس نے دستاویزات مجھ سے لے کر ایک طرف رکھ دیں۔

''اور مجھے تمہاری بیماری کی بھی بہت فکر ہے۔''

''شکریہ...... یہ بیماری تو اب کچھ لمبی ہو گئی ہے۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں!''

مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی روشنی نظر آئی۔ جیسے وہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے اس میں اب بھی دلچسپی تھی۔ میں اسے یہ قائل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا کیوں کہ میں نے پہلی مرتبہ اس شخص کی آنکھوں میں جذبات کی ہلکی سی رمق دیکھی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنا پہلا سا انداز دوبارہ اپنا لیا تھا، وہی خالی سے تاثرات اور پھیکی سی مسکراہٹ!

ایک آہ بھر کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اور یکلخت وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میرے بیٹے، یہاں آنے کا بہت شکریہ!''

اس کی آواز میں گرم جوشی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ میرے محسوسات سے

واقف ہو چکا تھا۔

بلاشبہ، اس ملاقات کے بعد ہم قریب ہونے لگے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ مجھ سے مختلف انداز سے پیش آتا تھا۔ میرے ذہن سے کبھی یہ خیال نہ گزرا کہ کہوں وہ میری صحبت میں سکون محسوس کرنے لگا تھا، یا پھر وہ مجھ پر کھلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ جیسا ہی کم گو، الگ تھلگ سا آدمی تھا۔ درحقیقت، ایسی شامیں بھی ہوتیں جب ہم دفتر سے اکٹھے باہر نکلے اور پیدل اس کے گھر گئے۔ کبھی کبھار میں اس کے ساتھ گھر کے اندر بھی جاتا اور سرخ کرسیوں والی بیٹھک میں کافی پیتا۔ لیکن ان مواقع پر ہم محض عام معاملوں پر ہی گفتگو کرتے...... انقرہ میں رہنا کس قدر مہنگا تھا، اور پھر عصمت پاشا محلے کی سڑکیں کس قدر ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ شاذ ہی ہوتا کہ وہ اپنے خاندان یا بچوں کا کوئی تذکرہ کرتا۔ وقتاً فوقتاً وہ بتاتا کہ ''میری بیٹی نے اس بار پھر ریاضی میں اچھے نمبر نہیں لیے!'' اور پھر کسی دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کر دیتا۔ ان مواقع پر میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس سے کچھ مزید پوچھا جائے۔ آخر کار، جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا تو اس کے خاندان نے مجھ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔

مریض سے رخصت ہونے کے بعد میں اس راہداری سے گزرتا ہوا باہر کی طرف بڑھا جہاں پندرہ سولہ برس کی عمر کے دولڑکے اپنی ہی ہم عمر ایک لڑکی کے ساتھ کھیل رہے تھے اور یہ انتظار کیے بغیر کہ میں ان کی طرف پشت موڑوں، وہ مجھے دیکھ کر سرگوشیاں کرنے اور دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے حلیے میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر ہنسا جا سکے۔ لیکن بے سمجھ بچوں کی مانند جیسا کہ وہ تھے، انہوں نے کسی بھی ایسے شخص پر ہنس کر خود کو اہم ثابت کرنا چاہا جو ان کے پاس سے گزرتا۔ حتیٰ کہ ننھی نورتن بھی پیچھے نہ رہی۔ بعدازاں جب کبھی میں آتا، ہر دفعہ کم و بیش یہی منظر دیکھتا۔ میں بذات خود ایک نوجوان آدمی اور عمر کے پچیسویں برس میں تھا لیکن اپنے ہم عمر اور اپنے سے کم عمر لوگوں میں موجود اس نئی عادت سے محروم تھا کہ جہاں انہوں نے پہلی بار کسی اجنبی کو پایا، اسے مارے تجسس کے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگتے، یوں جیسے انہوں نے پہلے کوئی انسان نہ دیکھا ہو۔ یہ بات اب مجھ پر واضح ہو چکی تھی کہ راعف آفندی کے گھریلو حالات کچھ خوش گوار نہ تھے: وہ اسے ہمیشہ ضرورت کی کسی شے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

بعد میں، جب میرا اس گھر میں آنا جانا ہوگیا، میں ان بچوں کو زیادہ بہتر طور پر جاننے لگا۔ وہ برے قطعاً نہیں تھے۔ اس کی بجائے ان کے اندر کچھ تھا ہی نہیں۔ ان کی شوخی کا سبب ہی یہ تھا۔ یہ ان کے اندر کا خالی پن ہی تھا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کا مضحکہ اڑاتے اور حقارت آمیز سلوک کرتے تھے، یہی ان کی تسکین کا ذریعہ تھا کیوں کہ اسی طرح وہ اپنی ذات کو جان سکتے تھے۔ میں سنتا تھا کہ جس انداز میں وہ ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ ویدات اور جہاد، وزارتِ اقتصادی امور میں کم عمر ترین کلرک تھے لیکن وہ بس اپنے ساتھ کام کرنے والے ہر کسی پر تنقید کرتے تھے۔ راعف آفندی کی بڑی بیٹی نجلا اپنے ہم جماعتوں کے خلاف ہی بولتی۔ لوگ جس طرح چلتے یا جس طرح لباس پہنتے، یہ ہمیشہ دوسروں کا مذاق ہی اڑاتے حالاں کہ وہ خود بھی کم وبیش ویسے ہی تھے۔

''تم نے دیکھا، معلا نے اس شادی پر کیا پہنا تھا......'' (استہزائیہ ہنسی)۔
''تمہیں ضرور دیکھنا چاہیے تھا کہ اس لڑکی نے ہمارے اور حان کی کس طرح بے عزتی کی۔'' (مضحکہ اڑاتی ہنسی)۔

اس دوران، راعف آفندی کی سالی فرحندے حانم کی زندگی کا واحد مقصد اپنے دو بچوں، جن کی عمریں تین اور چار برس تھیں، کی دیکھ بھال اور (اگر وہ اپنی بڑی بہن کو ان کی دیکھ بھال پر راضی کر لیتی)، چہرے پر بھاری میک اَپ کر کے اور ریشمی لباس پہن کر شام کو تفریح کے لیے باہر جانا تھا۔ چند ایک بار جب میں نے اسے دیکھا، وہ بیٹھک میں الماری کے شیشے کے سامنے کھڑی اپنے لہر دار رنگے بالوں پر پردار ہیٹ پہن رہی تھی۔ اس کی عمر بلاشبہ تیس برس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے منہ اور آنکھوں کے گرد جھریاں پڑ چکی تھیں۔ اس کی بے چین نیلی آنکھوں میں ہمیشہ ایک افراتفری سی ہوتی جو بلاشبہ پیدائشی تھی۔ اس کے بچے ہمیشہ زرد رُو، گندے اور میلے کچیلے ہوتے اور وہ انہیں اس طرح پھٹکارتی جیسے اس کے کسی خوفناک دشمن نے انہیں اسے سزا دینے کے لیے بھیجا ہو، اس خدشے میں کہ کہیں وہ اپنے سنے ہوئے ہاتھوں سے اس کے نفیس لباس کو گندا نہ کر دیں۔

جہاں تک فرحندے کے خاوند نورالدین بے کا تعلق تھا، جو اس وقت وزارتِ

اقتصادی امور کی اسی شاخ میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا...... وہ حامدی کی نقل تھا۔ اس کی عمر ابھی تیس برس سے کچھ زیادہ ہی تھی، وہ ایسا شخص تھا، جو اپنے سیاہ گھنگریالے بالوں میں کنگھا کرتے کسی حجام کے معاون کی طرح اکڑ جاتا اور اگر سادہ سا جملہ ''تم کیسے ہو؟'' بھی بولتا تو یوں سر ہلاتا جیسے اس کے منہ کے دانش کے موتی جھڑ رہے ہوں۔ جب کوئی اس سے بات کرتا، وہ اسے گھورنے لگتا اور مسکراتا کہ جیسے کہہ رہا ہو، ''یہ کس قسم کی بے وقوفی ہے؟ کیسے تمہیں علم بھی ہے کہ تم کس طرح کی بات کر رہے ہو۔''

ووکیشنل کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بہ وجوہ اسے اٹلی بھیجا گیا تا کہ چمڑے کے کاروبار کے متعلق مزید علم حاصل کر سکے لیکن اس نے سوائے اطالوی کی شدھ بدھ اور کسی اہم شخصیت کے انداز و اطوار کے اور کچھ نہ سیکھا۔ اس کے ساتھ زندگی میں کامیابی کے حصول کے اس کے اپنے خیالات بھی شامل تھے۔ ابتدا میں وہ خود کو کسی اہم عہدے کا مستحق سمجھتا تھا، یوں اس نے زندگی کے ہر شعبے پر لاف زنی کی، خواہ اسے کسی بھی معاملے کے متعلق خفیف سا ہی علم تھا۔ ہر کسی شخص پر تنقید کر کے، اس نے انہیں اپنی اہمیت کا قائل بھی کر لیا تھا۔ (جہاں تک میرا اندازہ ہے، اس گھر کے بچوں نے اپنے انکل سے ہی یہ عادت پائی تھی جس کی وہ بہت زیادہ تعریف کرتے تھے)۔ مزید یہ کہ وہ بہت اچھا لباس پہنتا، ہر روز شیو بناتا، خیال رکھتا کہ بکثرت استعمال کے باعث پتلی پتلون خوبی سے استری ہو اور وہ ہر ہفتہ کو اپنے لیے جدید فیشن کے جوتے اور انتہائی خوبصورت موزے خریدنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، اس کی تمام تر تنخواہ، اس اور اس کی بیوی کے کپڑوں پر اٹھ جاتی تھی۔ اس کے دو بہنوئی، پینتس فی کس لیرا سے زیادہ نہ کماتے تھے جس سے مراد یہ تھی کہ راعف آفندی کو اپنی قلیل تنخواہ میں پورے گھر کا خرچ چلانا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود، بے چارے بوڑھے شخص سے قطع نظر، نورالدین بے اپنے گھرانے کے ہر فرد سے ملازموں جیسا سلوک کرتا تھا۔ وہ راعف آفندی کی بیوی، مہریے ہانم کے متعلق بھی یہی سمجھتے تھے۔ اس کی عمر اگرچہ چالیس برس نہیں تھی، لیکن وہ قبل از وقت بوڑھی، موٹی ہو چکی تھی اور اس کا بدن ڈھل چکا تھا۔ وہ دن کا بیشتر حصہ باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف رہتی اور جب بھی اسے فرصت ملتی، وہ بچوں کے کپڑوں کے ڈھیر دھوتی رہتی اور اپنی بہن کے بچوں کی

دیکھ بھال کرتی ۔کوئی بھی اس کا ہاتھ نہیں بٹاتا تھا، جو یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کرتی وہ اس سے کہیں بہتر کے مستحق تھے ۔ جب کھانا ان کی پسند کا نہ ہوتا، اس وقت کا منظر بہت ناخوشگوار ہوتا ۔اس لیے جب نورالدین بے کہتا، ''میرے عزیز، اس کا کیا مطلب ہے؟'' اس کی آواز میں اس قدر خفگی اور طیش ہوتا جیسے اس نے سینکڑوں لیرا گھر کے خرچ کے لیے دیئے ہوں ۔اور دو بہنوئی اپنی سات لیرا کی نکٹائیاں پہن کر بیٹھتے اور کہتے، ''مجھے یہ پسند نہیں، میرے لیے انڈا بنا دو!'' یا ''میں اب بھی بھوکا ہوں، میرے لیے ساسیج لاؤ!'' وہ مہریے ہانم کو بار بار باورچی خانے بھیجنے سے قطعی دریغ نہیں کرتے تھے اور اگر انہیں اس کے باوجود شام کی روٹی لانے کے لیے گیارہ کورش کی ضرورت ہوتی، تو وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے کی بجائے بیمار راعف آفندی کو جگاتے اور جیسے یہی کافی نہ تھا، وہ مشتعل ہوجاتے کہ وہ وقت پر صحت یاب نہ ہوا تھا کہ ان کے لیے دکان سے روٹی لے آتا۔

اگرچہ گھر کے وہ حصے جہاں مہمانوں کا شاذ و نادر ہی آنا ہوتا، انتہائی بری حالت میں تھے، راہداری اور بیٹھک بہت ہی اچھے طریقے سے سجے تھے اور یہ سب نجلا کا کام تھا ۔اور پھر باقی افرادِ خانہ بھی اس وقت اپنا بھرم قائم رکھنے میں کامیاب رہتے، جب ان کے دوست آتے ۔

اس لیے فرنیچر کی قسطوں میں ادائیگی کے لیے انہوں نے مل جل کر رقم اکٹھی کی ۔لیکن اب بیٹھک میں سرخ مخملیں فرنیچر اور پھر ایک ریڈیو موجود تھا، جس کی بلند آواز سارے محلے میں گونجتی، جسے دیکھ کر ان کے مہمان مدہوش ہوجاتے ۔مزید برآں، شیشے کی الماری میں سونے کے پانی سے مرصع بلوریں برتن بھی تھے جنہوں نے کئی دفعہ نورالدین بے کے دوستوں کو متاثر کیا تھا جب اس نے انہیں راکی کی دعوت مشروب دی ۔

اگر یہ راعف آفندی ہی تھا جو یہ تمام خرچے اٹھاتا لیکن پھر بھی اس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں کوئی فرق نہ تھا ۔بڑے سے لے کر چھوٹے تک اس کنبے کا ہر فرد، اسے کسی بھی قسم کی اہمیت نہیں دیتا تھا ۔وہ اس سے اپنی روزمرہ ضروریات اور مالی مسائل کے متعلق ہی بات کرتے ۔ عام طور پر وہ مہریے ہانم کے ذریعے ہی راعف آفندی سے بات کرتے ۔وہ اسے ہر صبح اشیائے خریداری کی فہرست کے ساتھ کسی بے جان مشینی انسان کی طرح گھر سے بھیجتے اور شام کو وہ اپنے بازوؤں میں سب چیزیں بھرے گھر لوٹ آتا ۔پانچ برس قبل جب نورالدین بے کا فرحندے ہانم

کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا، وہ موزوں بر کا کردار نبھاتے ہوئے اپنے ممکنہ برادرِ نسبتی کو خوش کرنے کی خاطر کچھ نہ کچھ لاتا رہتا تھا، لیکن اب اس کا طرزِ عمل یوں تھا کہ جیسے ایسے کم اہم شخص کے ساتھ ایک گھر میں رہنا اس کے لیے بے عزتی ہو۔ وہ اس سے ناراض رہتے کہ وہ زیادہ نہیں کماتا کہ انہیں آسائشیں دے سکے لیکن اس کے ساتھ وہ اسے ایک ایسا شخص بھی سمجھتے جس کی ان کے نزدیک قطعی کوئی اہمیت نہ تھی...... جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ اپنے بڑوں کی طرف سے حوصلہ افزائی پا کر، نجلا بھی، جس کے مزاج ہی نہ ملتے تھے، اور حتیٰ کہ نورتن بھی جو ابھی پرائمری میں تھی، یہی خیالات رکھتی تھیں۔ وہ اس سے عجلت بھری محبت کا مظاہرہ کرتے، جب وہ کبھی بیمار پڑ جاتا، وہ اس کے ساتھ مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے جیسے کسی بھکاری سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مہرییے ہانم گھر کی گزر بسر کی خاطر محنت کرتے ہوئے شدید تھک جاتی، وہی دن میں کچھ وقت اس کے ساتھ گزارتی اور یہ بات یقینی بنانے کی کوشش کرتی کہ اس کے اپنے بچے اسے کمتر نہ سمجھیں یا اس سے نفرت نہ کریں۔

شاموں کو جب گھر میں مہمان آتے، وہ اپنے خاوند کو خواب گاہ میں کھینچ لاتی اور اس خدشے کے پیش نظر کہ نورالدین بے یا اس کا کوئی بھی بھائی یکدم چیخنے چلاّنے نہ لگیں، ''سودا لانے کے لیے انکل کو بھیج دو!'' وہ رسیلی آواز میں کہتی، ''تم جا کر ہمارے لیے آٹھ انڈے اور ایک بوتل راکی لے آؤ گے؟ ہمیں انہیں میز سے نہیں اٹھانا چاہیے۔'' لیکن اس نے خود سے کبھی نہ پوچھا کہ وہ اور اس کا خاوند اس میز پر کیوں نہیں بیٹھتے، کبھی کبھار وہ پارٹی میں شامل ہوتے بھی تو ان کے ساتھ اس قسم کا بے عزتی بھرا سلوک کیا جاتا...... اگرچہ شاید وہ اس سلوک کو محسوس بھی نہ کرتی تھی۔

راعف آفندی اس کے ساتھ عجیب طرح کی نرمی کا سلوک کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اسے اس خاتون پر رحم اور ترس آتا جو مہینوں اپنا ہاؤس کوٹ نہ اتار پاتی تھی۔ گاہے گاہے، وہ اس سے پوچھا کرتا، ''میری بیوی، تم کیسی ہو؟ کیا آج کا دن تھکا دینے والا تھا؟''

اور بعض اوقات، وہ اسے ایک طرف لے جاتا اور بچوں کی سکول میں کارکردگی کے بارے پوچھتا اور یہ بھی کہ آنے والی عید کے اخراجات کس طرح پورے ہوں گے۔

لیکن اس نے گھر کے کسی دوسرے فرد سے کسی وابستگی کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ بعض

اوقات وہ اپنی بڑی بیٹی پر اپنی نگاہ جمالیتا، اس امید میں کہ وہ اس سے کچھ خوشگوار اور میٹھی باتیں کرے گی۔ لیکن یہ لمحے جلد ہی گزر جاتے کہ جیسے اس لڑکی کی بے معنی ہنسی اسے اپنے درمیان موجود خلیج کی یاددہانی کروادیتی۔

میں نے اس بارے میں بہت سوچا تھا۔ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ راعف آفندی جیسا آدمی ...... وہ کس قسم کا آدمی تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ وہ ویسا نہیں تھا جیسا نظر آتا تھا...... کہ اس طرح کا کوئی شخص دانستہ اپنے انتہائی قریبی افراد سے دور ہوجاتا۔ مزید یہ کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اردگرد موجود لوگ اس کی حقیقی شخصیت جان لیں اور وہ کسی بھی طور پر اس قسم کا شخص نہیں تھا جو یہ کوشش کرتا کہ لوگ اسے جانیں۔ برف پگھلنے کا کوئی امکان نہیں تھا، یہ امکان کہ وہ شدید اور زبردست قسم کی کدورت دور ہوجائے جس نے انہیں منقسم کررکھا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کریں، ان کی ترجیح یہی ہوتی کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہی رہیں، وہ اس وقت ہی ایک دوسرے کی موجودگی محسوس کرتے جب ان کا کبھی آمنا سامنا ہوتا تھا۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راعف آفندی کو اپنی بڑی بیٹی نجلا سے کسی قسم کی توقع تھی۔ جس غلامی سے وہ بھاری میک اپ میں لدی اپنی خالہ کے انداز واطوار کی نقل کرتی، جس طرح وہ اپنے خالو سے روحانی رہنمائی حاصل کرنا چاہتی، پھر بھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کی ذات کے سخت خول کے اندر کوئی حقیقی شخص پوشیدہ ہو۔ جب وہ اپنے باپ کا احترام نہ کرنے پر اپنی چھوٹی بہن کی سرزنش کرتی تو بعض اوقات وہ غضب ناک ہوجاتی۔ اگر میز پر یا خواب گاہ میں دیگر لوگ راعف آفندی کا بہت مذاق اڑاتے، وہ منہ سے جھاگ اڑاتی اور کمرے کا دروازہ دھماکے سے بند کرتے ہوئے چلی جاتی۔ لیکن وہ یہ سب کچھ اس قدر سادہ انداز میں اپنے اندر کے حقیقی شخص کو اظہار کا موقع دینے کو کرتی تھی۔ اس کی مصنوعی شخصیت جس کی نشوونما برسوں میں ہوئی تھی، اس قدر زبردست تھی کہ اس کی حقیقی شخصیت کو دبانے میں کامیاب ہوجاتی۔

لیکن......اور شاید اس کی وجہ اس کے بچوں کی بے صبری تھی......ان تمام حالات میں

راعف آفندی کی نا قابل تسخیر خاموشی نے مجھے غصہ دلا دیا۔ گھر اور پھر دفتر میں بھی، اس نے ان لوگوں کا مذاق برداشت کرنے سے بڑھ کر کچھ کیا جن سے اس کی کوئی قدر مشترک نہیں تھی: وہ جیسے ان لوگوں کو پسند کرتا تھا جو اسے حقارت سے دیکھتے تھے...... میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ جن کے متعلق ان کے اردگرد موجود لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوں، اپنے مصائب میں ایک تلخی بھری مسرت پا کر اس پر فخر محسوس کرنے لگتے ہیں، لیکن میں نے یہ تصور کبھی نہیں کیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو بھی پسند کرنا چاہیں گے جو انہیں نیچا دکھاتے ہوں۔

میں نے کئی مواقع پر دیکھا تھا کہ وہ ایک ایسا شخص نہ تھا جو اپنے احساسات وجذبات کا برملا اظہار کرتا ہو۔ اس کے برعکس، میں اسے ایک محتاط، باریک بیں اور آسانی سے ناراض ہو جانے والے شخص کے طور پر جانتا تھا۔ وہ تمام حالات پر اس طرح نظر ڈالتا کہ کوئی بھی چیز اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہتی۔ ایک دفعہ جب اس کی دونوں بیٹیاں اس پر جھگڑ رہی تھیں کہ میرے لیے کافی کون لائے، وہ قطعاً کچھ نہیں بولا، لیکن دس روز بعد جب میں اس کے گھر گیا، اس نے اپنی بیٹیوں کو پکار کر کہا، ''اس کے لیے کافی مت لانا! اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں!''

اس واقعہ کا کئی بار ذکر کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ اس کے باعث وہ بہت پریشان ہوا۔ یوں اس نے اپنی ذات کو کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور اس کے بعد سے میں اس کے مزید قریب ہو گیا۔

لیکن پھر بھی ہماری گفتگو محض سطحی نوعیت کی حامل ہوتی تھی۔ لیکن اس بات نے مجھے مزید نہ الجھایا۔ کیا اس خاموش صبر میں خاصی مسرت نہ تھی...... دوسروں کی خامیوں کو ہمدلی کے ساتھ دیکھنے اور ان کی بے ہودگیوں سے لطف اندوز ہونے میں؟ جب ہم ساتھ ساتھ چلتے تو کیا مجھے اس میں موجود گہری انسانیت محسوس نہیں ہوتی تھی؟ تب ہی مجھے ادراک ہونا شروع ہوا کہ کیا وجہ تھی کہ لوگ الفاظ کے ذریعے ایک دوسرے کی جستجو نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے، اور کیوں کچھ شاعر ایسے ساتھیوں کی تلاش میں ہوتے تھے جو اُن کی طرح خاموشی سے قدرتی مظاہر کی خوبصورتی پر غور کرتے۔ اگرچہ مجھے علم نہ تھا کہ میں اپنے برابر خاموشی سے چلتے اس شخص سے کیا سیکھ رہا تھا، مجھے یقین تھا کہ میں اس شخص سے اس سے کہیں زیادہ سیکھ رہا تھا جو کوئی استاد مجھے

برسوں میں سکھاتا۔

اور میرا خیال تھا کہ وہ اب مجھے پسند کرنے لگا تھا۔ اب وہ پہلے جیسا ڈرپوک اور لیے دیئے نہ رہا تھا، جیسا وہ باقی سب لوگوں اور شروع میں میرے ساتھ بھی تھا۔ اگرچہ ایسے دن بھی آتے جب کسی قسم کی وحشت کا اظہار بھی ہوتا تھا؛ وہ اپنی آنکھیں بھینچ لیتا، اس کا چہرہ سپاٹ ہو جاتا اور جب اسے مخاطب کیا جاتا، وہ انتہائی محتاط انداز میں جواب دیتا ایسے لب و لہجے میں جس سے یہ تاثر ملتا کہ اس کی ذات تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے دنوں میں وہ ترجمے پر بھی توجہ نہ دیتا۔ اس کی بجائے وہ اپنی میز پر موجود کاغذوں کے پلندے کو دیر تک گھورتا رہتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کسی اور ہی زمانے میں پہنچ گیا ہو...... ایسی جگہ جو صرف اور صرف اس کی تھی...... اور میرا کوئی بھی عمل اسے اس دنیا، اس مقام سے واپس نہیں لا پاتا تھا۔ لیکن میں خوف کے ساتھ مزید کہوں گا، چاہے یہ کتنا ہی عجیب و غریب لگے، اس قسم کے دوروں کے بعد ہی وہ عام طور پر بیمار پڑ جاتا۔ جلد ہی قدرے افسوس بھرے انداز میں مجھے معلوم ہو جاتا کہ ایسا کیوں تھا۔

ماہ فروری کے وسط میں ایک روز، راعف آفندی دفتر نہیں آیا۔ جب میں اس شام اس کے گھر گیا تو مہر یے ہانم نے دروازہ کھولا۔

''کیا یہ تم ہو۔'' اس کی زبان سے نکلا، ''اوہ، اندر آ جاؤ۔ وہ ابھی سویا ہے...... لیکن اگر تم چاہو تو میں اسے جگا سکتی ہوں۔''

''نہیں، برائے کرم، بالکل نہیں۔'' میں نے کہا، ''میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اسے بخار ہے۔ اور اس دفعہ تو وہ پیٹ درد کی شکایت بھی کر رہا ہے۔'' پھر شکایتی لب و لہجے میں وہ کہنے لگی، ''بے چارہ، وہ تو اپنی صحت کا بھی خیال نہیں رکھتا...... وہ اب بچہ نہیں رہا۔ اسے بلاسبب غصہ آ جاتا ہے...... سمجھ نہیں آتی کہ کیوں...... وہ اب کسی سے بات نہیں کرتا...... سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے...... اور پھر دوبارہ بیمار ہو جاتا ہے...... اور پھر بستر پر آ جاتا ہے۔''

عین اسی لمحے، ہمیں راعف آفندی کی آواز سنائی دی جو ساتھ والے کمرے سے پکار رہا تھا۔ وہ خاتون بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں بے یقینی کے عالم میں تھا کہ اس خاتون کی بات سے

کیا مراد لوں۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی صحت کی بہت حفاظت کرتا تھا، خود کو کئی گرم کپڑوں میں لپیٹے رکھتا...... وہ کسی خفیف سی لاپروائی کا بھی کس طرح مرتکب ہو سکتا تھا؟

مہر یے ہانم واپس کمرے میں آ گئی۔ ''دروازے کی گھنٹی نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ اندر آ جاؤ!''

اس موقع پر راعف آفندی پوری طرح مایوس اور دل شکستہ معلوم ہوا۔ اس کی رنگت زرد پڑ چکی تھی اور اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کی روایتی بچگانہ مسکراہٹ سے اس بار مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ زبردستی اپنے چہرے کے عضلات کو کھینچ رہا ہو۔ اس کے چشمے کے پیچھے موجود اس کی آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ اجنبی معلوم ہوتی تھیں۔

''ہاں، راعف آفندی، کیا ہوا؟ ہمیں امید ہے کہ تم جلد ہی صحت یاب ہو جاؤ گے۔''

''تمہارا شکریہ!''

اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ جب وہ کھانسا، اس کی چھاتی سے آواز آئی۔

اپنے تجسس کو فوری طور پر رفع کرنے کی خاطر میں نے اس سے پوچھا: ''تمہیں یہ بخار کیسے ہوا؟ میرا خیال ہے کہ تم باہر گھومتے پھرتے رہے ہو گے۔''

کافی دیر وہ اپنے بستر کی سفید چادروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چھوٹی آہنی انگیٹھی، جسے اس کی بیوی اور بچوں نے بستروں کے درمیان گھسا دیا تھا، کمرے کو گرم کر رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے کمبل کو اپنے چہرے تک لاتے ہوئے اس نے کہا:

''ہاں، میں نے ہی خود کو سردی کا شکار کیا۔ کل رات کھانے کے بعد میں کچھ دیر باہر چلا گیا تھا۔''

''کیا تم کہیں گئے تھے؟''

''نہیں، میں محض چہل قدمی کرنا چاہتا تھا۔ کیوں، پتا نہیں۔ ممکن ہے کہ میں پریشانی محسوس کر رہا تھا۔''

مجھے یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ اس نے یہ تسلیم کیا کہ وہ پریشان تھا۔

''میں کچھ دور نکل گیا تھا۔ زرعی انسٹیٹیوٹ تک۔ پھر میں کیچی اورن نامی پہاڑی کے دامن تک جا پہنچا۔ کیا میں تیز چل رہا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے گرمی محسوس ہونے لگی۔ میں نے

اپنے کوٹ کے بٹن کھول دیئے۔رات تیز ہوا چل رہی تھی۔اور معمولی سی برف باری بھی ہوئی تھی۔ شاید مجھے ٹھنڈ لگ گئی۔''

رات کو سنسان سڑکوں پر چلتے ہوئے جبکہ تیز ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی اور برف باری بھی ہوئی ہو، اور جبکہ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن بھی کھول دیئے تھے...... مجھے اس سب کی راعف آفندی سے ہرگز توقع نہ تھی۔

''کیا تم کسی سلسلے میں پریشان ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے ترت جواب دیا: ''بالکل نہیں، میرے پیارے دوست۔ایسا ہوتا رہتا ہے، کبھی کبھار۔ یکلخت میرا دل چاہنے لگتا ہے کہ رات میں باہر نکل جاؤں۔کون جانے، ممکن ہے کہ اس گھر کا شور شرابہ مجھے باہر نکل جانے پر مجبور کرتا ہو!''

اور پھر جیسے اسے یہ خدشہ ہوا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کر چکا ہے: ''بعض اوقات لوگ ایسا کچھ کر بیٹھتے ہیں، جب ان کی عمر بڑھتی ہے۔یوں ہم اپنی جوان نسل کو کس طرح موردِ الزام ٹھہرا سکتے ہیں؟''

ایک دفعہ پھر میرے کانوں میں باہر کے شور اور سرگوشیوں کی آوازیں پڑنے لگیں۔ بڑی بیٹی کچھ لمحے پہلے ہی سکول سے واپس آئی تھی، اور پھر وہ اپنے والد کے رخساروں پر بوسہ دینے کے لیے اندر چلی آئی۔

''پیارے بابا، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

پھر وہ مڑی اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔''جناب، ہمیشہ یہی ہوتا ہے......کبھی ان کے ذہن میں اچانک کوئی خیال آتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ کافی خانے جا رہے ہیں، اور پھر، ممکن ہے کہ کافی ہاؤس میں انہیں ٹھنڈ لگ جاتی ہے یا پھر گھر واپسی کے راستے میں، لیکن یہ بیمار پڑ جاتے ہیں...... میں تو گنتی بھی بھول چکی ہوں...... مجھے نہیں معلوم کہ اس کافی خانے میں ہوتا کیا ہے!''

اپنا کوٹ اتار کر اس نے اب کرسی پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔راعف آفندی یوں دکھائی دیا جیسے وہ اس قسم کے رویے کا عادی ہو اور اسے زیادہ اہم نہ سمجھتا ہو۔

میں نے مریض کا چہرہ دیکھا۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے میری طرف مڑا اور اس کی

آنکھوں میں مجھے کسی بھی قسم کی روشنی، کوئی حیرت دکھائی نہ دی۔ اس نے اپنے خاندان سے جھوٹ کیوں بولا تھا، یہ معلوم کرنے سے زیادہ دلچسپی مجھے اس میں تھی کہ اس نے مجھے سچ کیوں بتایا، لیکن مجھے اس پر فخر بھی محسوس ہونے لگا: دوسروں کی نسبت کسی کے زیادہ قریب ہونے کا فخر۔

راعف کے گھر سے رخصت ہوکر اپنے گھر واپس جاتے ہوئے میں نے اپنا ذہن بھٹکنے دیا۔ اگر راعف واقعی ایک سادہ شخص ہوتا جس کے اندر کوئی گہرائی نہ ہوتی؟ یہ واضح تھا کہ اسے دوسروں، حتیٰ کہ اپنے قریب ترین لوگوں سے بھی کوئی مطلب، کوئی تعلق نہیں تھا...... وہ زندگی سے کس چیز کا خواہش مند تھا؟ کیا یہ اس کے اندر کا خالی پن تھا...... کسی بھی مقصد کا نہ ہونا...... جس نے اسے رات کے وقت سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے پر مجبور کر دیا؟

اس مقام پر میں نے جانا کہ میں اس ہوٹل پہنچ چکا تھا جہاں میری رہائش تھی۔ وہ چھوٹا سا کمرا جس میں میرا ایک دوست بھی میرے ہمراہ رہتا تھا، محض دو پلنگوں کی گنجائش رکھتا تھا۔ اس وقت آٹھ بج چکے تھے۔ مجھے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ اپنے کمرے میں چلا جاؤں اور کچھ دیر مطالعہ کروں لیکن فوراً ہی میں نے یہ خیال ترک کر دیا کیوں کہ رات کے اس پہر زمینی منزل پر واقع کافی خانے کا گراموفون اپنی پوری آواز سے بجتا تھا اور شبینہ کلب میں ملازم شامی فنکار، جو ساتھ والے کمرے میں رہتی تھی، تیاری کرتے ہوئے تیز بلند آواز میں عربی میں نغمہ سرائی کیا کرتی تھی۔ اس لیے میں واپس مڑا اور تارکول کی گدلی سڑک پر کیچی اورن کا رخ کیا۔ ابتدا میں یہاں صرف کار مرمت کی کچھ دکانیں اور قطار در قطار کچھ خستہ حال کافی خانے واقع تھے۔ پھر دائیں طرف، پہاڑوں کی بلند ہوتی ہوئی چوٹیوں پر مکان بھی تھے اور بائیں طرف پہاڑی دامن میں واقع باغات میں ٹنڈ منڈ درخت ایستادہ تھے۔ میں نے اپنے اوورکوٹ کا کالر اونچا کر لیا۔ ہوا تیز اور بھیگی ہوئی تھی۔ اس وقت یکلخت مجھ پر ایک وحشی خواہش نے غلبہ پا لیا جو عام طور پر اس وقت نمودار ہوتی جب میں مخمور ہوتا: میں چلتا رہوں بلکہ دوڑنے لگوں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے میں اسی عالم میں گھنٹوں بلکہ دنوں سفر کر سکتا تھا۔ میں بھول چکا تھا کہ میں کہاں تھا۔ میں بہت دور تک چلتا گیا۔ اب ہوا پہلے سے کہیں تیز ہو چکی تھی اور میرے سینے پر دباؤ ڈال رہی تھی لیکن مجھے آگے قدم بڑھانے میں تگ و دو کرنے پر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

پھر اچانک میں نے سوچا کہ میں یہاں کیوں تھا...... خوامخواہ...... بے وجہ۔ یہاں آنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا، میں تو بس یونہی چلا آ رہا تھا۔ سڑک کی دونوں اطراف موجود درخت تیز سرد ہوا کے ساتھ آہ وزاری کرر ہے تھے، آسمان پر بادل بھی تیزی سے امڈے آ رہے تھے۔ پہاڑوں میں سیاہ عمودی چٹانیں ابھی دکھائی دے رہی تھیں اور ان کی طرف بڑھتے ہوئے بادل لگتا تھا کچھ حصہ اپنے پیچھے چھوڑے جا رہے تھے۔ اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے نم فضا میں سانس بھرا اور ایک دفعہ پھر میں نے خود سے پوچھا: میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ ہوا کی روانی گزشتہ شب جیسی ہی تھی اور شاید اب خفیف سی برف باری بھی ہونے لگی تھی...... محض ایک رات پہلے کوئی اور شخص یہاں آوارہ گردی کرتا رہا تھا، اس کے چشمے پر دھند جم رہی تھی، اس کا ہیٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی قمیص کے بٹن کھلے تھے، اور وہ یوں جیسے دوڑ رہا تھا...... تیز سرد ہوا اس کے سر کے چھدرے بالوں کو چیر رہی تھی اور کون جان سکتا تھا کہ اس تیز سرد ہوا نے ان کے گرم سر کو کس قدر ٹھنڈا کیا ہو؟ اس کے سر کے اندر، ذہن میں کیا تھا؟ کیا بات اُس سر، اس معذور اور بڑھتی عمر کے بدن کو یہاں کھینچ لائی تھی؟ میں اپنے تصور میں راعف آفندی کو اس تاریک یخ رات میں چلتے دیکھنا چاہتا تھا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیسے اس کا چہرہ بدلتا۔ اور اب میں سمجھ گیا کہ مجھے کیا چیز یہاں کھینچ لائی تھی: ممکن ہے کہ یہاں آنے پر مجھے اس کے یہاں آنے کا مقصد سمجھ آ سکے، یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے ذہن میں کیا بات سمائی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت میں محض اپنا ہیٹ اڑاتی تیز سرد ہوا، ماتم کرتے درختوں اور آسمان سے گزرتے شکل بدلتے بادلوں کو ہی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ان مقامات پر ہونا، اس کے جیسا ہونا نہیں تھا۔ ایسا فرض کرنے کے لیے آپ کو میری طرح جلد باز اور احمق ہونا پڑے گا۔

میں نے تیزی سے واپس ہوٹل کی طرف بڑھا۔ اب کافی خانے کا گراموفون خاموش تھا اور شامی عورت گا نہیں رہی تھی۔ میرا دوست بستر پر پڑا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ ''کس چکر میں ہو؟ رات بھر عیاشی کرنے کے بعد واپس آئے ہو ناں؟''

لوگ کس قدر آسانی سے ایک دوسرے کو پڑھ سکتے ہیں!...... اور پھر میں تھا جو کسی کے دماغ میں جھانکنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا تاکہ معلوم کر سکوں کہ اس میں نہاں روح باترتیب تھی یا

مضطرب۔ حتیٰ کہ کوئی شکستی حال اور سادہ ذہن شخص بھی حیران کن ہوسکتا تھا، حتیٰ کہ کوئی احمق بھی ایسی روح کا حامل ہوسکتا تھا، جس کا شوریدہ کرب حیرت کا باعث ہو۔ ہم اس چیز کا ادراک کرنے میں اس قدر سست کیوں ہیں اور ہم یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ دوسروں کے متعلق رائے زنی اور انہیں جاننا دنیا کا آسان ترین کام ہے؟ کیوں، جب ہم پہلی بار دیکھنے پر پنیر کے ٹکڑے کو بھی بیان کرنے سے ہچکچاتے ہیں، ہم کیسے لوگوں کا پہلی بار سامنا کرتے ہی ان کے متعلق کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں اور خوشی خوشی انہیں ٹھکرا دیتے ہیں؟

دیر تک میں سو نہ سکا۔ میں اس کی بیٹیوں کے جوان بدنوں اور اس کی بیوی کے تھکے ہارے ہاتھ پاؤں کی خوشبو سے بھرے کمرے میں سفید چادروں میں لپٹے بخار زدہ راعف آفندی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی آنکھیں مندی تھیں اور کون جانے اس کی روح کس جہان کی سیر کر رہی تھی؟

اس مرتبہ راعف آفندی کی بیماری طویل ہوگئی۔ یہ معمول کی سردی لگنے سے بڑھ کر کچھ تھا۔ نورالدین نے جس ڈاکٹر کو بلایا تھا، اس نے سرسوں کی پیسٹ اور کھانسی کا شربت تجویز کیا۔ میں ہر دو تین روز بعد راعف آفندی کی عیادت کو جاتا اور ہر بار اس کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ بگڑی ہوئی پاتا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ بس کندھے اچکا دیتا۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا کنبہ پریشان نہ ہو۔ لیکن مہرپے ہانم اور نجلا سے سے یہ قطعی برعکس تھا۔ ان کا رویہ انتہائی بے آرام کرنے والا تھا۔ سالوں کی مشقت نے جیسے اس کی بیوی سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی: وہ غنودگی کے عالم میں ایک سے دوسرے کمرے میں گھومتی رہتی، جب راعف کی کمر پر پیسٹ کی مالش کرتے ہوئے تولیے اور طشتریاں نیچے گراتی؛ وہ ہمیشہ چیزیں رکھ کر بھول جاتی اور ان کی تلاش میں چکراتی پھرتی۔ میں اب بھی اسے عجلت کے عالم میں ہر سمت میں گھومتے اور اس کی بے ایڑی چپلوں سے نکلتے اس کے پاؤں دیکھ سکتا ہوں۔ میں اب بھی اس کی ملتجی نگاہیں خود پر محسوس کرسکتا ہوں۔ نجلا بھی اپنی ماں کی طرح عقل سے عاری اور کھوئی کھوئی تھی۔ وہ اپنے باپ کی دیکھ بھال کی خاطر سکول سے چھٹیاں کیے ہوئے تھی۔ جب میں شام کو مریض کو دیکھنے آتا، اس کی سرخ سوجی ہوئی آنکھوں سے بتا سکتا تھا کہ وہ روتی رہی تھی۔ لیکن راعف بے کو یہ

سب برہم کرتا تھا۔ اگر ہمیں کبھی تنہا ہونے کا موقع ملتا، وہ اس کی شکایت کرتا۔ ایک بار تو وہ کہنے لگا: ''ایمان داری سے! ان دونوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ کیا میں موت کے دہانے پر ہوں؟ اور اگر میں مر بھی گیا تو کیا ہوگا؟ وہ کیا پرواہ کریں گے؟ میں ان کے نزدیک کیا ہوں؟''

بعدازاں، ایسے لب و لہجے میں جس میں دکھ ہی دکھ تھا، بلکہ بے رحم، اس نے کہا: ''میں ان کے نزدیک کچھ نہیں...... کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ برسوں ہم اسی مکان میں رہتے رہے ہیں...... کبھی بھی انہوں نے خود سے یہ نہیں پوچھا کہ ان کی زندگی کا شریک یہ شخص کون ہے...... اور اب انہیں فکر لاحق ہوگئی ہے کہ میں انہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں......''

''بس کرو، راعف بے! برائے کرم!'' میں چلاّ اٹھا، ''تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ درست ہے کہ وہ غیر معمولی بے چینی محسوس کر رہی ہیں لیکن اپنی بیوی اور بیٹی کے متعلق اس طرح کی باتیں کرنا اچھا نہیں!''

''ہاں، وہ میری بیوی اور بیٹی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں......'' اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔ اس کے آخری الفاظ سن کر میں اس سے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

افرادِ خانہ کو اطمینان دلانے کی خاطر نورالدین بے نے ایک ماہر معالج کو بلایا۔ طویل معائنے کے بعد اس شخص نے نمونیا کی تشخیص کی، اور صدمے کا ادراک کرتے ہوئے جو اس نے انہیں پہنچایا تھا، کہنے لگا: ''میرے عزیزو، یہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں۔ اس کی قوتِ ارادی بہت مضبوط ہے اور اس کا دل خوبی سے کام کر رہا ہے۔ یہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اس کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ اسے ٹھنڈ نہیں لگنی چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ تم اسے ہسپتال لے جاؤ!''

ہسپتال کا لفظ سن کر مہر بے ہانم کے ضبط کا یارا نہ رہا۔ راہداری میں موجود ایک کرسی پر گرتے ہوئے اس کے منہ سے سسکیاں نکلنے لگیں۔ نورالدین کا چہرہ بگڑ گیا کہ جیسے اس کے وقار کو ٹھیس پہنچی ہو۔ ''اس میں کیا منطق ہے؟'' اس نے کہا، ''ہسپتال کی نسبت گھر پر اس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہو سکے گی۔''

معالج نے اپنے کندھے اچکائے اور چلا گیا۔

پہلے تو راعف آفندی ہسپتال جانے کے حق میں تھا، یہ کہتے ہوئے کہ ''کم از کم میں

وہاں خود کو سوچتے سن سکوں گا!'' یہ واضح تھا کہ وہ تنہائی کا متمنی تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ سب اس کے کس قدر خلاف تھے تو اس نے ہار مان لی۔ بے بسی سے مسکراتے وہ بڑبڑایا، ''یہ مجھے وہاں بھی چین سے نہیں رہنے دیں گے!''

ایک روز مجھے خاص طور پر یاد ہے۔ وہ جمعے کا دن تھا اور میں اس کے ساتھ والی کرسی پر خاموش بیٹھا اس کے سینے کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کے بستر کے قریب موجود میز پر ادویات کے درمیان پڑی ایک بڑی جیبی گھڑی کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں کھولتے ہوئے مریض کہنے لگا: ''میں آج کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں!''

''بالکل۔ اور یہ بیماری ہمیشہ تو رہے گی نہیں......''

اس پرشاکی لب ولہجہ میں اس نے کہا: ''ٹھیک ہے، لیکن یہ سب کب تک چلے گی؟''

اس کا اصل مطلب جان کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ اس کے لب و لہجہ میں موجود افسردگی اور شکستہ دلی نے بلاشبہ مجھے اس کے حقیقی معنوں سے آشنا کر دیا تھا۔

''برائے کرم، راعف بے، کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہوا کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگا: ''بہت خوب۔ لیکن ٹھیک کیا ہے؟ کیا یہ کافی نہیں؟''

اس موقع پر مہر یے ہانم کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ میرے قریب آ کر مجھ سے کہنے لگی: ''آج یہ بہتر محسوس کر رہا ہے! معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر تندرست ہو رہا ہے، اللہ کا شکر ہے!''

پھر وہ اپنے خاوند کی طرف مڑی۔ ''ہم کپڑے دھلوانے کے لیے بھجوا رہے ہیں۔ کیا تم اس آدمی کو کہہ سکتے ہو کہ تمہارا تولیہ لا دے؟''

راعف نے خوش دلی سے اپنا سر ہلایا۔ چند دراز کھنگالنے کے بعد خاتون کمرے سے باہر چلی گئی۔ مریض کی حالت میں خفیف سی بہتری نے اس کی تمام فکریں ختم کر دی تھیں۔ اب وہ وہی پرانی مصروف گھریلو خاتون تھی جو کھانا پکانے اور کپڑوں کی دھلائی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

سب سادہ لوگوں کی طرح، وہ لحہ بھر میں دکھ سے خوشی، ہیجانی کیفیت سے سکون وطمانیت میں بدل سکتی تھی، اور تمام عورتوں کی طرح وہ ہر چیز بہت جلد بھول گئی۔

راعف آفندی کی آنکھوں میں مجھے ایک گہری دکھی مسکراہٹ نظر آئی۔ اپنے پلنگ کے پائے سے لٹکی جیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، وہ کہنے لگا: ''دائیں طرف کی جیب میں تمہیں ایک چابی ملے گی۔ اسے لو اور دفتر میں میری میز کی سب سے اوپر والی دراز کھول کر وہ تولیہ لے آنا جس کا میری بیوی پوچھ رہی تھی...... میں تمہیں تکلیف دے رہا ہوں، لیکن......''

''میں کل صبح لے آؤں گا!''

چھت پر نظریں جما کر وہ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر یکلخت میری طرف مڑا۔ ''میری دراز میں جو کچھ موجود ہو، سب لے آنا! جو کچھ بھی تمہیں وہاں ملے...... میری بیوی کو لگتا ہے کہ معلوم ہو چکا ہے کہ اب میں کبھی واپس دفتر نہیں جاؤں گا۔ میں کہیں اور نکل جاؤں گا......''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر تکیے میں چھپالیا۔

اگلے روز دفتر سے رخصت ہونے سے پہلے میں راعف بے کی میز کی طرف گیا۔ اس کے دائیں طرف تین درازتھیں۔ سب سے پہلے میں نے نچلی دو دراز کھولیں۔ ایک خالی تھی جبکہ دوسری میں بے شمار کاغذات اور تراجم کے مسودے موجود تھے۔ سب سے اوپری دراز کے تالے میں چابی ڈالتے ہوئے، ایک سرد لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ اب مجھے ادراک ہو گیا تھا کہ میں ایک ایسی کرسی پر بیٹھا ہوں جس پر ایک عرصہ راعف آفندی بیٹھتا رہا اور وہ کام کر رہا ہوں جو راعف بے ہر روز کئی مرتبہ کرتا تھا۔ میں نے جلدی سے دراز کھولی۔ یہ تقریباً خالی تھی لیکن ایک گندا سا تولیہ، اخباری کاغذ میں لپٹا ہوا صابن، کھانے کے برتن کا ڈھکن، ایک چمچ اور ایک جیبی چاقو اس میں موجود تھے۔ میں نے جلدی جلدی یہ چیزیں لپیٹ لیں۔ میں کھڑا ہوا اور دراز کو بند کرنے ہی والا تھا جب مجھے یہ خیال آیا کہ دیکھ لوں کہ اس میں کوئی چیز تو نہیں رہ گئی۔ میں نے یہ دراز دوبارہ کھولی اور اپنا ہاتھ اندر ڈال دیا اور دراز کے آخری کونے میں مجھے ایک نوٹ بک محسوس ہوئی۔ میں نے یہ بھی دوسری چیزوں کے ساتھ رکھ لی اور فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ تاہم، میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ شاید اب راعف بے کو اس کرسی پر دوبارہ بیٹھنا یا دراز کھولنا دوبارہ نصیب نہ ہو۔

جب میں گھر واپس پہنچا تو وہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ نجلا نے دروازہ کھولا، مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا سر ہلایا اور کہنے لگی: ''پوچھیں بھی مت!'' اب میں اس گھرانے کا ایک فرد بن چکا تھا اور کوئی بھی مجھے اجنبی نہیں سمجھتا تھا۔ لڑکی کہنے لگی: ''بابا کی حالت دوبارہ بگڑ گئی ہے۔ درحقیقت، آج ان پر دو دورے پڑے۔ انکل نے ڈاکٹر کو بلایا اور وہ اس وقت بابا کے پاس ہے، انہیں ٹیکہ لگا رہا ہے......'' یہ کہتے ہوئے وہ مریض کے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

میں اس کے پیچھے اندر نہیں گیا۔ اس کی بجائے میں راہداری میں موجود ایک کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ پیکٹ میرے سامنے پڑا تھا۔ اگرچہ مہر یے ہانم چند مرتبہ باہر نکلی لیکن مجھے یہ چیزیں اس کے حوالے کرنے پر بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اندر کمرے میں موجود شخص زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور اس وقت یہ ٹھیک نہ تھا کہ میں گھر کے کسی فرد کے حوالے اس کا گندا تولیہ اور ایک پرانا کانٹا کروں۔ اس لیے میں اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی میز کے گرد چکر لگانے لگا۔ الماری کے اوپر لگے شیشے میں دیکھتے ہوئے مجھے ایک اور دھچکا لگا۔ میں یرقان زدہ دکھائی دیا۔ میرا دل تیز دھڑکنے لگا۔ زندگی اور موت کے درمیان عظیم خلیج پر ہونے والی جنگ بلاشبہ بہت خوفناک تھی۔ اس کی بیوی، بیٹیاں اور رشتہ دار اس کے اردگرد جمع تھے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ مجھے ان سے زیادہ راعف کے لیے دکھ اور وابستگی کا اظہار کرنے کا کوئی حق نہیں۔

عین اسی لمحے میں بیٹھک کے دروازے کی چرچراہٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ قریب ہونے پر میں نے راعف آفندی کے برادرہائے نسبتی، ویدات اور جہاد کو دیکھا۔ وہ ایک صوفے پر ساتھ بیٹھے سگریٹ نوشی کر رہے تھے۔ وہ بالکل الگ تھلگ بیٹھے تھے اور گھر میں محبوس ہونے کی بنا پر مایوس دکھائی دیتے اور ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے تھے۔ نورتن آرام کرسی پر بیٹھی تھی، اس کا سر اس کے بازوؤں پر لٹکا ہوا تھا، وہ رو یا پھر سو رہی تھی۔ کچھ دور راعف آفندی کی سالی فرحندے اپنے دونوں بچوں کو گود میں لیے بیٹھی، انہیں شور مچانے سے منع کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا ہر لفظ اور ہر عمل بتا رہا تھا کہ بچوں کو سنبھالنے اور بہلانے میں وہ کس قدر اناڑی تھی۔

مریض کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آیا، نورالدین اس کے پیچھے تھا۔ اپنی طرف سے تمام تر بے پروائی کا اظہار کرنے کے باوجود وہ بے چین دکھائی دیتا تھا۔

''اسے اکیلا مت چھوڑو۔''ڈاکٹر نے کہا،''اور اگر دوسرا دورہ پڑے تو ان میں سے ایک ٹیکہ اسے لگادو۔''

نورالدین بے نے تیوری چڑھائی،''کیا وہ خطرے میں ہے؟''

اس وقت ڈاکٹر نے وہی کچھ کہا جو اس قسم کی صورتِ حال میں سب ڈاکٹر کہتے ہیں۔''یہ کہنا مشکل ہے۔''

مزید سوالات سے بچنے کی خاطر، یا پھر مریض کی بیوی کی طرف سے ہراساں کیے جانے سے بچنے کے لیے اس نے فوراً اپنا کوٹ اور ہیٹ پہنا، نورالدین سے تین نقرئی لیرا لیے، ہنکارا بھرا اور گھر سے رخصت ہوگیا۔

آہستہ آہستہ میں مریض کے کمرے کے دروازے تک چلا آیا۔ میں نے اندر جھانکا۔ مہریے خانم اور نجلا، راعف کے سرہانے کھڑی تشویش کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھی۔ جب چھوٹی لڑکی کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے مجھے اشارے سے بلایا۔ مجھے اب محسوس ہوا کہ وہ دونوں ماں بیٹی دیکھنا چاہتی تھیں کہ میں اپنے دوست کو دیکھنے پر کیسا ردِعمل ظاہر کرتا ہوں۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے خود پر قابو پانے کی ازحد کوشش کی۔ میں نے یوں سر ہلایا جیسے سب ٹھیک تھا۔ پھر میں اپنی بائیں جانب مڑا۔ وہ ایک دوسرے سے جڑی بیٹھی تھیں۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی کی ایک مسکراہٹ سجائی۔''خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے وہ ٹھیک ہوجائے گا۔''

میرے دوست نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے دیکھا لیکن پہچان نہیں پایا۔ پھر بہت کوشش کرتے ہوئے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کی طرف مڑا۔ اس نے کچھ سرگوشی کی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اپنے چہرے کو بھینچتے ہوئے اس نے کسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی۔

نجلا اس کے پاس گئی۔''پیارے بابا، آپ کو کیا چاہیے؟''

''جاؤ، کچھ دیر باہر چلی جاؤ۔''اس نے کمزور اور بھاری آواز میں کہا۔

مہریے ہانم نے مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ باہر چلوں لیکن جب مریض نے

اسے یہ اشارہ کرتے دیکھا تو اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھ کر یہ کہتے ہوئے میری کلائی اپنی گرفت میں لے لی، ''تم یہیں ٹھہرو!''

اس کی بیوی اور بیٹی حیران ہو گئیں۔ ''پیارے بابا، احتیاط کریں! اپنے بازو چادر سے باہر نہ نکالیں!''

راعف نے تیزی سے اپنا سر ہلایا کہ جیسے کہہ رہا ہو، ''مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے!'' ایک دفعہ پھر اس نے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔

پھر اس نے چیزوں کے اس پلندے کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا حالاں کہ میں اس کے متعلق بھول چکا تھا۔ ''کیا تم ہر چیز لے آئے؟''

پہلے تو میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ یہ کہنے سے اس کی مراد کیا تھی۔ یا شاید میں حیران تھا کہ وہ ان چیزوں کو اس قدر اہمیت کیوں دے رہا تھا؟ میرا دوست ابھی تک مجھے گھور رہا تھا جبکہ اس کی آنکھیں بے چینی سے چمک رہی تھیں۔

اور پھر اسی لمحے مجھے اس مشہور سیاہ نوٹ بک کا خیال آیا۔ میں نے تو اس کو کھولنے یا اس کے مندرجات کے متعلق حیران ہونے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ راعف آفندی اس قسم کی کوئی چیز اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔

پیکٹ کو کھولتے ہوئے میں نے تولیہ اور دیگر چیزیں دروازے کے عقب میں موجود ایک کرسی پر رکھ دیں۔ نوٹ بک اٹھا کر میں نے راعف آفندی کی طرف بڑھا دی۔ ''کیا تمہیں یہی چاہیے تھی؟''

اس نے سر ہلا دیا۔

آہستہ آہستہ ورق گردانی کرتے ہوئے مجھ پر تجسس غالب آتا گیا۔ لکیروں والے صفحات پر بے ترتیب اور ٹیڑھی میڑھی تحریر انتہائی عجلت کی عکاس تھی۔ میں نے پہلے صفحے پر نظر ڈالی۔ کوئی عنوان نہیں دیا گیا تھا۔ دائیں طرف تاریخ درج تھی: 20 جون 1933ء۔ اس کے عین نیچے یہ سطر تھی: ''کل میرے ساتھ ایک عجب واقعہ پیش آیا، اور اس نے مجھے ماضی میں دھکیل دیا جسے میں سمجھتا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے پیچھے چھوڑ آیا ہوں......''

اس کے بعد جو لکھا تھا، میں نے نہیں پڑھا۔ راعف آفندی نے ایک دفعہ پھر اپنا بازو کمبل سے باہر نکال کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''اسے مت پڑھو!'' اس نے کہا۔ کمرے کی دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی: ''اسے ادھر پھینک دو!''

میں دیکھنے کی خاطر مڑا۔ ابرق کی چادر کے پیچھے مجھے آتش دان کی چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔

''تم چاہتے ہو کہ میں اسے جلا دوں؟''

''ہاں!''

اب مجھے مزید تجسس ہوا۔ میں اپنے ہاتھوں کو راعف آفندی کی یہ نوٹ بک جلانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا، یا پھر مجھے یہ نوٹ بک نذرِ آتش نہیں کرنی چاہیے تھی۔

''راعف بے، اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا، ''کیا یہ باعث شرم نہیں؟ اس نوٹ بک کو ضائع کرنے کی کیا تک ہے جس نے برسوں تمہارے دوست کا کردار نبھایا؟''

''اب یہ میرے کام کی نہیں رہی!'' اس نے کہا اور دوبارہ آتش دان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اب کسی بھی کام کی نہیں!''

میں اب یہ دیکھ سکتا تھا کہ میں اسے قائل نہ کر سکتا تھا۔ میں نے تصور کیا کہ اس نے اپنی وہ روح ان صفحوں میں رکھ دی تھی جو وہ ہم سے چھپائے رکھتا تھا اور اب وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

میں نے اس شخص کی طرف دیکھا جو اپنے پیچھے کچھ بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، جو اس کے باوجود کہ وہ موت کی جانب جا رہا تھا، چاہتا تھا کہ اپنی تنہائی بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ اور میں نے اس کے لیے رحمت کی دعا کی۔ اس کے ساتھ میرا اپنا تعلق بھی اتنا ہی تھا۔

''راعف بے، میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے کہا، ''میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تمہیں اپنی ہر چیز کو خود تک رکھنے کا حق ہے۔ تمہارا یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ تمہیں یہ نوٹ بک ضائع کر دینی چاہیے...... لیکن کیا تم محض ایک دن مزید انتظار نہیں کر سکتے؟''

اس نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے اس کی وجہ پوچھی۔

آخری دفعہ اپنے کیس کو آگے بڑھانے کی خاطر، میں اس کے قریب ہو گیا۔ میں نے اس امید پر اس کی آنکھوں میں جھانکا کہ میری اپنی آنکھوں سے اس محبت اور انس کا اظہار ہو سکے جو میں اس کے لیے محسوس کرتا تھا۔

''کیا تم یہ نوٹ بک ایک رات کے لیے میرے پاس نہیں چھوڑ سکتے؟ ہم بہت عرصے سے دوست ہیں اور تم نے اپنے متعلق مجھے کبھی ایک لفظ نہیں بتایا۔...... کیا تمہیں واقعی عجیب لگتا ہے کہ مجھے کچھ مزید جاننے کی خواہش ہو سکتی ہے؟ کیا تم ابھی تک محسوس کرتے ہو کہ تمہیں مجھ سے بہت کچھ چھپانا چاہیے؟ تم میرے لیے دنیا کے قیمتی ترین شخص ہو...... لیکن اس کے باوجود، تم مجھے اسی طرح دیکھنا چاہتے ہو جس طرح تم دوسروں کو دیکھتے ہو...... اجنبی...... اور مجھے چھوڑ دینا چاہتے ہو؟''

میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میری چھاتی دھونکنی کی مانند چلنے لگی لیکن پھر بھی میں کہتا گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ناراضی اور رنجش جو گزشتہ کئی مہینوں سے میرے اندر اُبل رہی تھی، ایک دم باہر آنے کو تھی: ''تم دوسروں پر اعتماد نہ کرنے میں درست ہو سکتے ہو۔ لیکن کیا کوئی استثنا نہیں؟ بالکل نہیں؟ مت فراموش کرو، تم بھی انسان ہو...... تم اس وقت محض خود غرضی کا مظاہرہ کر رہے ہو، اور بلا وجہ!''

یہاں میں رک گیا، یہ سوچ کر کہ ایک ایسے شخص سے بات کرنے کا یہ کوئی طریقہ نہیں جو شدید بیمار تھا۔ وہ بھی خاموش تھا۔ اس لیے میں نے اپنی آخری کوشش کی: ''راعف بے، برائے کرم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو! میں تو اس سفر کا آغاز کر رہا ہوں جس کے اختتام کے تم قریب ہو۔ میں لوگوں کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ سب سے اہم یہ کہ میں وہ سب سمجھنا چاہتا ہوں جو لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا۔''

سر کو شدت سے جھٹکتے ہوئے اس نے میری بات کاٹ دی۔ وہ سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں آگے بڑھا، اتنی قریب کہ اس کا سانس اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔

''نہیں! نہیں!'' اس نے کہا، ''کسی نے میرے ساتھ کچھ نہیں کیا...... ایسی کوئی بات نہیں۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں...... یہ میں ہی تھا...... ہمیشہ سے، یہ میں ہی تھا......''

اچانک وہ خاموش ہو گیا۔اس کی ٹھوڑی اس کی چھاتی سے جا لگی۔اب اس کا سانس کہیں زیادہ تیزی سے چل رہا تھا۔واضح طور پر اس بات نے اس کی تمام توانائی چھین لی تھی۔ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ اس نوٹ بک کو آتش دان میں پھینک کر یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔

ایک دفعہ پھر مریض نے اپنی آنکھیں کھول لیں۔''اس میں کسی کا بھی قصور نہیں! حتیٰ کہ میرا بھی نہیں!'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔اب وہ کھانسنے لگا تھا۔بالآخر اس نے آنکھوں سے نوٹ بک کی طرف اشارہ کیا۔''اسے پڑھ لو، تم جان لو گے!''

میں نے اس قدر تیزی سے یہ سیاہ نوٹ بک اپنی جیب میں ڈالی کہ جیسے میں اسی سب کی توقع کر رہا تھا۔

''میں اسے کل واپس لا کر تمہاری آنکھوں کے سامنے جلا دوں گا۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔انتہائی لاپروائی سے جو اس کے پہلے تاثر کی نفی کرتی تھی، راعف آفندی نے اپنے کندھے یوں اچکائے کہ جیسے کہہ رہا ہو: ''جو چاہو کرو!''

اور میں جانتا تھا کہ وہ اتنی دور جا چکا تھا کہ اس نوٹ بک سے اس کا تعلق ختم ہو چکا تھا جس میں اس نے اپنی زندگی کے اہم ترین واقعات قلم بند کیے تھے۔میں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر جانے کی اجازت چاہی۔جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے واپس کھینچ لیا تاکہ میری پیشانی اور پھر میرے رخساروں پر بوسہ دے سکے۔جب میں نے اپنا سر اٹھایا، تو اس کے چہرے پر آنسو بہتے دیکھے۔انہیں چھپانے یا صاف کرنے کی بجائے وہ بغیر پلکیں جھپکائے مجھے دیکھتا رہا۔اور پھر میں نے خود سے قابو کھو دیا، میں بھی رونے لگا...... بے آواز سسکیاں بھرنے لگا جو ایک گہرے اور منفرد دکھ کا سامنا کرنے کا نتیجہ تھیں۔مجھے معلوم تھا کہ اسے چھوڑ کر جانا کس قدر مشکل ہوگا۔لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس پر مجھے شدید تکلیف ہوگی۔

ایک دفعہ پھر راعف آفندی کے لرزتے ہونٹوں سے ایک نہایت ہی نحیف آواز نکلی:
''جب سے ہم دونوں شناسا ہوئے ہیں، ہم نے اس قدر طویل گفتگو کبھی نہیں کی......کیسی شرم کا مقام ہے!'' اور یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اور اب یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ چکے ہوں۔ باہر منتظر لوگ میرے چہرے کو نہ دیکھ پائیں، اس لیے میں انتہائی تیز رفتاری سے راہداری سے ہوتا ہوا باہر دروازے تک پہنچ گیا۔ باہر یہ خود کلامی کرتے چلتے ہوئے سرد ہوا نے میری آنکھیں خشک کر دیں: ''کیسی شرم کا مقام ہے! کیسی شرم کا مقام ہے!''

جب میں واپس ہوٹل پہنچا، میرا ساتھی سو چکا تھا۔ میں بھی بستر میں گھس گیا اور پلنگ کے ساتھ پڑی میز پر موجود لیمپ روشن کیا اور اس نوٹ بک کے سیاہ غلافوں کے درمیان موجود تحریر کو فوراً پڑھنے لگا۔

◆

20 جون 1933ء

کل میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور اس نے مجھے ماضی میں دھکیل دیا جسے میں سمجھتا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ یادیں میرا پیچھا کبھی نہیں چھوڑیں گی...... ایک اور آمنا سامنا اور میں بے رحمی سے بیدار ہو جاؤں گا، اس بے حس و حرکت کاہلی سے نکل آؤں گا جو مجھے گزشتہ دس برس سے لاحق رہی ہے۔ میں جھوٹ بولوں گا اگر میں یہ کہوں کہ یہ مجھے پاگل بنا سکتی ہے، یا میری موت کا باعث بن سکتی ہے۔ کسی نہ کسی طور لوگ اس چیز سے ہم آہنگ ہو ہی جاتے ہیں جو انہیں ابتدا میں ناقابل برداشت محسوس ہوتی ہے۔ میں بھی برداشت کر لوں گا...... لیکن کیسے؟ جب میں مستقبل میں جھانکتا ہوں تو مجھے محض زندگی کی بے رحم کرب ہی نظر آتی ہے۔ تاہم، کسی نہ کسی طور میں اسے برداشت کر لوں گا...... بالکل جیسے میں اب تک برداشت کرتا آیا ہوں......

لیکن اب میں یہ سب کچھ اپنے سینے میں مزید مقید نہیں رکھ سکتا۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں، بے شمار باتیں جو میں کہنا چاہتا ہوں...... لیکن میں کس سے کہوں؟...... کیا اس دنیا میں کوئی اور ذی روح بھی بھٹک رہا ہے جو میری طرح تنہا ہو؟ میری آواز یہاں کون سنے گا؟ میں کہاں سے

شروع کروں؟ مجھے یاد نہیں کہ گزشتہ دس برس میں مَیں نے کبھی کسی سے کچھ کہا ہو۔ غیر ضروری طور پر میں نے معاشرے سے فرار حاصل کیا، بغیر ضرورت لوگوں کو خود سے پرے دھکیلا۔ لیکن اب میں کیا کرسکتا ہوں؟ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ کاش میرے پاس کچھ الفاظ ہوتے، کاش میرا کوئی رازداں ہوتا......لیکن اب میں اسے کیسے تلاش کروں؟ مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں تلاش کروں۔ اور اگر میں نے اسے تلاش کر بھی لیا تو میں کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔ بلاشبہ، میں نے یہ نوٹ بک خریدی ہی کیوں؟ اگر مجھے ذرا بھی سی امید ہوتی، تو کیا اب میں یہاں بیٹھا زندگی بھر کے معمولات کے برخلاف یہ الفاظ لکھ رہا ہوتا؟ لیکن بعض اوقات لوگ اپنے بوجھ سے آزادی چاہتے ہیں......کاش کل کا دن نہ آیا ہوتا......اوہ، کاش سچ سے میرا سامنا نہ ہوتا......میں اپنی معمولی اور چھوٹی چھوٹی آسائشوں کے ساتھ پہلے کی طرح ہی زندگی بسر کررہا ہوتا۔

جب میں کل ایک سڑک پر چلا جا رہا تھا جب اتفاق سے مجھے دو لوگ ملے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جس سے میری پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی اور دوسرا شخص وہ جو اس کرۂ ارض پر میرے لیے سب سے اجنبی تھا۔ کون یہ تصور کرسکتا تھا کہ ان دونوں میں وہ طاقت تھی کہ وہ میری شخصیت کی نفی کرسکیں؟

بہت ہوگیا! اگر مجھے اپنی یہ کہانی سنانی ہے تو پھر مجھے نہایت سکون کے ساتھ اس کا آغاز کرنا چاہیے......درحقیت، اس ضمن میں مجھے ماضی کے ان چند برسوں کی طرف لوٹنا ہوگا؛، دس یا زیادہ درست طور پر کہوں تو بارہ......شاید پندرہ......شاید، ان برسوں کی خاک چھانتے ہوئے، انہیں مکمل طور پر جیتے ہوئے، سب دہشتیں اور معمولی تفصیلات، میں خود کو آزاد کروا سکتا ہوں۔ شاید جو کچھ میں لکھوں، وہ اس قدر اذیت ناک نہ ہو کہ جس طرح میں نے اسے جیا ہے اور یہ مجھے قدرے تسلی اور اطمینان دے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس میں سے کچھ بھی اس قدر سادہ نہ ہی پیچیدہ ہے کہ جیسا میرا خیال تھا، تو پھر یہ بھی ممکن تھا کہ میں اس چیز کو اپنے لیے باعث شرم محسوس کرتا......شاید......

میرے والد کا تعلق حاوران سے تھا، میں بھی وہیں پیدا ہوا اور وہیں میری پرورش اور

ابتدائی تعلیم بھی ہوئی۔ بعد ازاں میں ایدریمت میں ایک ایسے ہائی سکول میں داخل ہو گیا جو ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ جنگ عظیم اوّل کے خاتمے کے وقت جب میری عمر اٹھارہ برس تھی، مجھے فوج میں بھرتی کر لیا گیا لیکن عملی طور پر فوجی ملازمت شروع ہونے سے پہلے ہی جنگ بندی ہو گئی۔ واپس گھر آنے پر میں دوبارہ ہائی سکول میں داخل ہو گیا اور لیکن گریجویشن نہ کر سکا۔ مجھے اپنی پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ گزرے برس کے ہنگاموں نے میری تمام دلچسپی ختم کر دی تھی۔

جنگ بندی کے بعد افراتفری کا عالم برپا ہو گیا۔ اس وقت کوئی فعال حکومت موجود نہ تھی اور نہ ہی کوئی مشترک نظریات یا مقاصد تھے۔ بہت سے علاقے غیر ملکیوں نے ہتھیا لیے تھے اور اچانک بہت سے گروہ منظر عام پر آ گئے، جن میں سے کچھ نے دشمن کے خلاف نئے محاذ کھول لیے جبکہ دیگر مقامی دیہات کو لوٹ کھسوٹ رہے تھے؛ ایک ڈاکو جسے ایک دن سورما قرار دیا گیا، ایک ہفتے بعد ہی قتل کر دیا گیا جبکہ اعلان یہ کیا گیا کہ اس کی لاش ایدریمت کے قریب کنا کنو کے دیہی چوک پر لٹک رہی تھی۔ ایسے وقت میں کوئی صورت نہ تھی کہ گھر بیٹھ کر عثمانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے یا پھر اخلاقیات پر مقالے پڑھے جائیں۔ تاہم، میرے والد، جو ان علاقوں میں دولت مند ترین افراد میں شمار ہوتے تھے، مصر رہے کہ مجھے تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اپنے بے شمار ساتھیوں کو دیکھتے ہوئے کہ انہوں نے کمر میں اسلحہ کی پیٹیاں باندھیں، اپنے کندھوں پر بندوق لٹکائی اور باغیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور انہیں ڈاکوؤں یا دشمنوں کے ہاتھ قتل ہونا پڑا، وہ میرے مستقبل کے متعلق تشویش کا شکار ہونے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں فارغ نہیں بیٹھنا چاہتا تھا اور خفیہ طور پر میں اپنی طرف سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ لیکن پھر دشمن افواج نے ہمارے گاؤں پر قبضہ کر لیا اور میرے تمام دلیرانہ خواب ملیا میٹ ہو گئے۔

میں چند ماہ تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ میرے اکثر دوست غائب ہو چکے تھے۔ میرے والد نے مجھے استنبول بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مجھ سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔ ''کوئی سکول تلاش کرو اور پڑھائی شروع کر دو۔'' انہوں نے کہا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے متعلق کس قدر کم جانتے تھے۔ اگرچہ میں ہمیشہ ایک ناکارہ، کم گو اور تنہائی پسند شخص رہا تھا، مجھ میں بھی ایک حسرت اور تمنا موجود تھی۔ ایک سبق ایسا تھا جس باعث میرے

استاد میری تعریف کرتے تھے: میں مصوری بہت اچھی کر سکتا تھا۔ اکثر میں یہ خواب دیکھتا رہتا تھا کہ میں استنبول کی فائن آرٹس اکیڈمی میں داخل ہو چکا ہوں۔ یوں کہا جا سکتا کہ میں ان کم گو اور خاموش لڑکوں میں سے تھا جو حقیقی دنیا کی نسبت خوابوں کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ مزید برآں، میں بہت شرمیلا بھی تھا اور اسی وجہ سے لوگ غلطی سے مجھے احمق بھی سمجھ لیتے اور ان کا یہ رویہ مجھے بہت پریشان کرتا۔ اس سے زیادہ کوئی چیز مجھے خوف زدہ نہیں کرتی تھی کہ میں اپنے متعلق موجود غلط تاثر کو کس طرح درست کروں۔ اگرچہ اکثر مجھے اپنے ہم جماعتوں کی غلطیوں کا بھی مرتکب سمجھا جاتا تھا، میں نے اپنے دفاع میں کبھی کچھ کہنے کی جرأت نہ کی تھی۔ بس میں اپنے گھر کے کسی کونے میں چھپ کر رو لیتا۔ مجھے بہت اچھی یاد ہے کہ کس طرح میری والدہ، حتیٰ کہ میرے والد اپنے ہاتھ جھٹکتے اور کہتے: ''صاف بات تو یہ ہے کہ تمہیں تو لڑکی ہونا چاہیے تھا!'' تاہم، میں اس وقت بہت ہی خوش ہوتا جب میں اکیلا دریا کنارے بیٹھا ہوتا، یا پھر باغ کے کسی گوشے میں بیٹھا سوچوں میں گم ہوتا۔ میرے خواب حقیقی زندگی کے بالکل برعکس تھے کیوں کہ یہ مہم جویانہ اور دلیرانہ کارناموں سے بھرے ہوتے تھے۔ بے شمار ناولوں کے مرکزی کرداروں کی مانند جو میں نے ترجمہ کرتے ہوئے پڑھے تھے، میں ایک شیریں اور مخفی خواہش کا اسیر ہو گیا تھا؛ میرے معاملے میں اس لڑکی کا نام فہریے تھا، جو ہمارے ہمسائے ہی میں رہتی تھی۔ اپنے اردگرد وفادار ساتھیوں کو جمع کرتے ہوئے جن کے ساتھ میں نے دور افتادہ زمینوں پر ہنگامے برپا کیے، میں اپنا نقاب پہن لیتا، اپنے کمر سے اپنی دو بندوقیں باندھ لیتا اور اسے اٹھا کر پہاڑوں میں واقع کسی شان دار غار کی طرف روانہ ہو جاتا۔ میں تصور کرتا کہ کیسے وہ پہلے خوف سے لرزنے لگتی لیکن جب وہ دیکھتی کہ کس طرح میرے آدمی میری موجودگی میں کانپتے تھے، جب وہ غار کے بے مثل خزانوں کو دیکھتی، اس پر مرعوبیت طاری ہو جاتی، اور جب بالآخر وہ میری آنکھوں میں جھانکتی تو بے قابو خوشی کے عالم میں روتے ہوئے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر دیتی۔ بعض اوقات میں کسی مشہور سیاح کی طرح افریقہ کا سفر کرتا، آدم خوروں کے درمیان زندگی بسر کرتا، اجنبی سرزمینوں کا مشاہدہ کرتا؛ اور پھر کبھی میں کسی مشہور مصور کی حیثیت سے یورپ کا دورہ کر رہا ہوتا۔ اگرچہ یہ وہ مصنفین تھے...... مائیکل زیواکو، جولیس ورن، الیگزینڈر ردوما، احمد مدحت آفندی اور وجیہہ بے...... جن کے ناول میں نے

پڑھے تھے، جنہوں نے میرے تصورات کو مصور کیا تھا۔

میرے والد کو میرا ہر وقت مطالعہ کرنا ناپسند تھا اور بعض اوقات تو وہ میری کتابیں اٹھا کر باہر پھینک دیتے۔ بعض راتوں کو وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں روشنی بھی نہیں کرنے دیتے تھے لیکن میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی حل نکال لیتا اور جب انہوں نے مجھے چھوٹے س ے لیمپ کی روشنی میں The Mysteries of Paris یا Les Miserables پڑھتے ہوئے دیکھا تو ہار مان لی اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ جو کچھ بھی میرے ہاتھ لگتا، میں پڑھ لیتا، خواہ یہ Monsieur LeCoq کی مہمات ہوتیں یا پھر مراد بے کی تاریخ ہوتی...... ان کتابوں نے مجھ پر اپنے اثرات چھوڑے۔

مثال کے طور پر رومی سلطنت کی تاریخ تھی جس میں Mucius Scaevola نامی ایک سفیر کو ایک معاہدہ طے کرنے کے دوران بتایا گیا کہ اسے شرائط منظور کرنی ہوں گی یا پھر اذیت ناک موت قبول کرنی ہوگی: اس نے جواب میں اپنا بازو آگ پر رکھ دیا اور نہایت سکون کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ اس کی ناقابل تسخیر جرأت سے متاثر ہو کر میں نے بھی اپنی قوتِ ارادی کی آزمائش کی خاطر اپنا ہاتھ آگ میں ڈالا جس کے باعث میری انگلیاں بری طرح جل گئیں۔ میں ابھی تک اپنے تصور میں اس سفیر کو اس تکلیف اور اذیت کے عالم میں پرسکون انداز میں مسکراتا دیکھ سکتا ہوں۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا جب میں نے لکھنے کی طرف بھی توجہ دی؛ بلاشبہ، میں نے چند نظمیں لکھ بھی لیں لیکن جلد ہی میں نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ قطع نظر کہ میرے سینے میں کیا پوشیدہ تھا، میں انتہائی مبہم انداز میں اسے ظاہر کرنے کی خواہش میں مبتلا تھا، اس لیے لکھنے کی میری مہم جوئی اختتام کو پہنچی۔ تاہم، میں نے مصوری جاری رکھی کیوں کہ میرے خیال میں اس طرح کوئی ذاتی چیز افشا ہونے کا خدشہ نہ تھا۔ اگر میں بیرونی دنیا سے کوئی چیز، کوئی خیال، کوئی تصور لے کر اسے کاغذ پر زندہ کر دیتا، میں محض تبدیلی کا محرک ہوتا اور بس۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ مجھے یہ ادراک ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں اور یوں میں نے مصوری بھی ترک کر دی...... اور ہمیشہ اسی خوف میں مبتلا رہا......

استنبول کی فائن آرٹس اکیڈمی میں، جلد ہی...... بغیر کسی کی مدد کے...... اس نتیجے پر پہنچا کہ مصوری تاثرات کے اظہار کا ذریعہ اور ناگزیر طور پر اظہارِ ذات کا ایک طریقہ ہے، اور یہ کہ

اس کے بعد کوئی سوال نہیں تھا کہ میں وہاں اپنی تعلیم جاری رکھتا۔ بہر حال، جو بھی معاملہ تھا، اساتذہ کو مجھ میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ میں تو محض معمولی کوشش ہی کر پاتا: اگر میری تصاویر کسی کو ذاتی طور پر متاثر کر دیتیں، یا میری ذاتی انفرادیت ظاہر ہو جاتی، تو میں انہیں چھپانے کے لیے آخری حدود تک بھی چلا جاتا، مبادا انہیں دن کی روشنی میں دیکھا جا سکے۔ اگر کوئی مجھ میں کوئی صلاحیت دریافت بھی کر لیتا، بے تکلفی کے عالم میں کسی برہنہ خاتون کی مانند میں ہانپنے لگتا اور شرم کے مارے وہاں سے بھاگ جاتا۔

گومگو کی حالت میں کہ اب میں کیا کروں، میں کچھ دیر کے لیے استنبول کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ وہ جنگ بندی کے دن تھے اور یہ شہر نامحسوس طور پر ہنگامہ خیز تھا کہ میں اسے بمشکل ہی برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے والد سے رقم طلب کی تاکہ میں حاوران واپس چلا جاؤں۔ دس دن بعد مجھے ایک طویل خط موصول ہوا۔ یہ ان کی آخری کوشش تھی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔

کہیں سے انہوں نے سن لیا تھا کہ جرمنی کی کرنسی کی قدر گر چکی تھی اور خاص طور پر غیر ملکی وہاں بہت آرام سے رہ سکتے تھے۔ استنبول کی نسبت جرمنی میں بہت کم رقم میں گزارا کیا جا سکتا تھا۔ مجھے صابن، خاص طور پر خوشبودار صابن کے کاروبار کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خاطر ہدایت کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ وہ میری سفری اخراجات کے لیے رقم بھجوا رہے ہیں۔ یہ سن کر میں بہت خوش ہوا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے صابن سازی کے فن میں دلچسپی تھی، بلکہ اس لیے کہ مجھے یورپ جانے کا موقع مل رہا تھا کیوں کہ بچپن سے ہی یہ میرا بہت ہی پسندیدہ خواب تھا۔ ''ایک دو برس وہاں اس کاروبار کے متعلق سیکھو۔'' میرے والد نے لکھا تھا، ''اور پھر تم گھر واپس آ سکتے ہو اور صابن سازی کے کارخانوں میں بہتری لانے کے لیے کام کر سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک مینیجر مہیا کروں گا۔ کاروبار کی دنیا میں اپنے قدم جما کر تم یقینی طور پر خوشی اور خوش حالی حاصل کر لو گے۔'' لیکن یہ بات میرے ذہن میں سب سے آخر میں آئی تھی......

میرا منصوبہ تھا کہ میں ایک غیر ملکی زبان سیکھوں اور اس سے بھی اہم کہ یورپ کو دریافت کروں...... یورپی لوگوں سے بالمشافہ ملاقات کروں جن کے متعلق میں نے ابھی محض

کتابوں میں ہی پڑھا تھا۔ کیا وہی لوگ نہیں تھے جنہوں نے میری متجسس فطرت میں نکھار پیدا کیا تھا اور گھر سے اتنی دور جانے کی ترغیب دی تھی؟

میں ہفتے بھر میں تیار ہو گیا۔ میں نے ٹرین کے ذریعے جرمنی کا سفر کیا جو بلغاریہ کے راستے وہاں پہنچی۔ میں صرف ترکی زبان ہی بول سکتا تھا۔ چار دن پر مشتمل سفر کے دوران زبان کے متعلق جیبی رہنما کتاب کے ذریعے میں نے تین چار فقرے سیکھ لیے تھے، جن کے باعث میں پنشن نامی مہمان خانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا پتہ میں نے استنبول ہی میں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا تھا۔

میں نے پہلے چند ہفتے اس قدر جرمن زبان سیکھنے میں تاکہ میں یہاں رہنے کے قابل ہو سکوں اور استعجاب کے عالم میں جرمنی کی سڑکوں پر آوارہ گردی میں صرف کیے۔ لیکن زیادہ عرصہ تک حالات یوں نہیں رہ سکے۔ آخر میں مجھے پتا چلا کہ یہ تو بہت ہی مختلف شہر ہے۔ سڑکیں قدرے چوڑی اور کہیں زیادہ صاف تھیں جبکہ مکینوں کے بالوں کی رنگت سنہری اور آنکھیں نیلی تھیں۔ تاہم، یہاں کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جو مجھے متاثر کر پاتی۔ اپنے تصور کے یورپ کے متعلق بہت کم جانتے ہوئے، میں تصور کا تقابل اس شہر سے نہیں کر سکتا تھا جہاں میں رہتا تھا...... مجھے ابھی یہ جاننا تھا کہ اس دنیا کی کوئی بھی شے ان تعجب خیز تخیلات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو ہم اپنے اذہان میں کر سکتے ہیں۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ جب تک میں زبان نہ سیکھ لوں، میں اپنا کام شروع نہیں کر سکوں گا، میں نے ایک ریٹائرڈ افسر سے زبان کے اسباق پڑھنے شروع کر دیئے جس نے جنگ کے دوران تھوڑی بہت ترکی سیکھی تھی۔ پنشن ہوٹل کی منتظمہ کو فارغ وقت میں مجھ سے ہلکی پھلکی گفتگو بہت پسند تھی اور اس میں میرا بھی بہت فائدہ تھا۔ دریں اثنا، پنشن کے دیگر مہمان ایک ترک کو دوست بنا کر بہت خوش تھے اور وہ قسم قسم کے احمقانہ سوالات کی بارش مجھ پر کیے رکھتے۔ کھانے کی میز کے اردگرد زندہ دل لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ خاص طور پر تین افراد نے مجھے اپنے سائے میں لے لیا تھا: فاؤ وین ٹائیڈ مین نامی ایک ڈچ بیوہ، ہیر کیمرا نامی ایک پرتگیز تاجر جو کینری جزائر سے مالٹے درآمد کرتا تھا، اور پھر ادھیڑ عمر ہیر دوبکے۔ وہ کیمرون کی نوآبادی میں کاروبار کر رہا تھا؛ جنگ بندی

کے بعد سب کچھ چھوڑ کر وہ اپنے وطن لوٹ آیا تھا۔ یہاں وہ ایک سادہ زندگی گزار رہا تھا، دن بھر وہ سیاسی اجلاسوں میں شرکت کرتا اور شام کو وہ اپنے دن بھر کے تاثرات سنانے کے لیے پنشن واپس آ جاتا۔ کئی ایک مواقع پر وہ اپنے ساتھ حال ہی میں سبکدوش ہوئے لیکن ابھی تک بے روزگار جرمن افسر بھی لے آتا جن کے ساتھ وہ گھنٹوں گفتگو کرتا رہتا۔ ان تمام کی گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ان تمام کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جرمنی کو صرف اس صورت میں بچایا جا سکتا تھا کہ بسمارک کے آہنی ارادے والا کوئی شخص برسراقتدار آ جائے تا کہ فوج کی ازسرنو تنظیم کی جائے اور ایک اور عالمی جنگ کے ذریعے ماضی کی ناانصافیوں کا انتقام لیا جائے۔

گاہے بہ گاہے کوئی مکین یہاں سے چلا جاتا اور اس کی جگہ کوئی نیا مکین آ جاتا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میں ان تبدیلیوں کا عادی ہو گیا۔ میں ان سرخ لیمپوں سے بہت بیزار ہونے لگا جو اس اندھیرے کمرے کو روشن کرتے جہاں ہم کھانا کھاتے تھے، میں گوبھی کی مستقل بُو سے بھی تنگ آ جاتا جبکہ وہ پُرجوش سیاسی بحث بھی مجھے بیزار کر دیتی جو ہر کھانے کے بعد شروع ہو جاتی۔ خصوصاً بحث...... ہر کسی کے پاس آئیڈیا تھا کہ جرمنی کو کیسے بچایا جائے۔ تاہم، ان میں سے کسی تجاویز کا جرمنی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو اپنے ذاتی مفادات سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھی خاتون، جو مہاجنوں کے ہاتھوں اپنی دولت سے محروم ہو چکی تھی، ان افسران سے ناراض تھی جو ہڑتالی کارکنوں سے ناراض تھے۔ وہ فوجیوں کو جرمنی کی شکست کا مرتکب ٹھہراتی جبکہ نوآبادیاتی تاجر بغیر کسی واضح وجہ کے ہمیشہ ہی شہنشاہ کے اعلانِ جنگ کو تنقید کا نشانہ بناتا رہتا۔ حتیٰ کہ منتظمہ بھی میرے ساتھ سیاسی بحث شروع کر دیتی جب وہ صبح میرا کمرا صاف کرنے کے لیے آتی، اور جب بھی اسے کوئی فرصت کا لمحہ ملتا، وہ خود کو اخبار میں غرق کر دیتی۔ اس کی بھی بہت جارحانہ رائے ہوتی تھی اور اسے بیان کرتے ہوئے وہ کے لہراتی اور اس کے چہرے کا رنگ چقندر جیسا ہو جاتا۔

یوں تھا جیسے میں فراموش کر چکا تھا کہ میں جرمنی کس لیے آیا تھا۔ جب بھی مجھے والد کی طرف سے خط موصول ہوتا، مجھے صابن کے کاروبار کی یاددہانی کرائی جاتی اور میں جواب میں لکھتا کہ میں ابھی تک جرمن سیکھ رہا ہوں، اور میں انہیں یقین دلاتا کہ بہت جلد میں ایک مناسب تربیتی

کالج تلاش کرلوں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں انہیں اور خود کو بھی دھوکا دیتا۔ دن گزرتے رہے۔ میں نے سارا شہر دیکھ لیا، میں عجائب گھر اور چڑیا گھر بھی گیا۔ میں نے سوچا، چند مہینوں کے دوران میں دیکھ چکا تھا کہ لاکھوں افراد کے اس شہر کے پاس مجھے دینے کو کیا تھا اور اس چیز نے مجھے مایوسی میں دھکیل دیا۔ ''تو یہ یورپ ہے۔'' میں نے خود کلامی کی، ''یہ سب ہنگامہ کیوں ہے؟'' یہاں سے میں نے ایک مختصر نتیجہ اخذ کیا کہ دنیا بذاتِ خود بہت کم دلچسپی کی حامل جگہ ہے۔ اکثر اوقات میں بعد دوپہر چوڑی سڑکوں پر ہجوموں کے درمیان آوارہ گردی کرتا جب لوگ گھر واپس جا رہے ہوتے، ان کے فکرمند چہرے اہم کاموں کے عکاس ہوتے، یا پھر خواتین، جن کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ہوتی اور ان کی آنکھیں نیم غنودہ ہوتیں، اور انہوں نے ان افراد کے کاندھوں کا سہارا لیا ہوتا جو ابھی تک فوجیوں کی مانند چلتے ہوتے۔

اس لیے میں نے اپنے بہت سے ترک دوستوں کی مدد سے یہ انتظام کرلیا کہ اپنے والد سے صریح جھوٹ نہ بولوں اور ایک پُرتعیش صابن کے صنعت کار کے ہاں چلا گیا۔ وہ فرم جو سویڈن کے ایک بڑے ادارے کی سرپرستی میں چل رہی تھی، اس کے جرمن ملازمین نے میرا پُرتپاک استقبال کیا......لیکن وہ صابن سازی کے ہر مرحلے کی تفصیل مجھے بتانے سے ہچکچا رہے تھے جس کا بہت کم تقابل اس معلومات سے کیا جا سکتا تھا جو کچھ میں نے حاوران میں سیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ ایسا کمپنی کے رازوں کی حفاظت کرنے کے باعث تھا۔

یا پھر شاید اس لیے کہ انہوں نے مجھ میں کوئی حقیقی عزم نہ دیکھا تھا اور وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے فیکٹری جانا بند کر دیا۔ انہوں نے بھی مجھ سے دوبارہ رابطہ نہ کیا۔ اب میرے والد بھی پہلے کے برعکس کم خطوط لکھنے لگے تھے۔ ادھر میں برلن میں بغیر یہ سوچے رہنے لگا کہ آئندہ کیا کروں گا یا پھر میں یہاں کیوں آیا تھا۔

میں اب بھی فوجی افسر سے ہفتے میں تین بار جرمن زبان کے سبق لے رہا تھا۔ میں دن بھر مختلف عجائب گھروں اور ان مصور خانوں میں جاتا جن کا قیام کچھ دیر پہلے ہی عمل میں آیا تھا۔ جب میں شام کو واپس ہوٹل آتا، مجھے سو قدم دور سے ہی گوبھی کی بو محسوس ہونے لگتی۔ لیکن اب میں اتنا بیزار نہیں تھا جس طرح اپنے قیام کے ابتدائی مہینوں میں مجھے کوفت ہوتی تھی۔ اب میں آہستہ

آہستہ پہلے سے کہیں بہتر انداز میں جرمن پڑھنے لگا تھا جس سے مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ دیرنہ گزری کہ یہ گویا ایک لت بن گئی۔ اپنے بستر پر اوندھا لیٹ کر میں اپنی کتاب کھولتا اور گھنٹوں مطالعے میں مصروف رہتا۔ میرے پاس ایک ضخیم پرانی لغت ہوتی۔ اکثر اوقات مجھے اس لغت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کیوں کہ میں لفظ کے سیاق وسباق ہی سے اس کے معانی سمجھ جاتا۔ ایک نئی دنیا مجھ پر طلوع ہوگئی تھی۔ میں اب بچپن کی ان کتابوں کے مطالعے سے بہت دُور نکل گیا تھا جن میں دلیر اور بہادر سورما بے مثال مہمات انجام دیتے۔ اب جس قسم کی کتابیں میرے زیرِ مطالعہ تھیں، وہ میرے جیسے لوگوں کی کہانی سناتی تھیں، وہ دنیا جو میں دیکھتا اور سنتا تھا۔ یہ کتابیں ان چیزوں کی بات کرتیں جن کا میں نے مشاہدہ کیا لیکن انہیں کُلی طور پر سمجھ نہ پایا تھا۔ اب ان کے حقیقی معانی مجھ پر آشکار ہونے لگے تھے۔ روسی کتب نے مجھ پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے۔ میں نے ترگنیف کی تمام کہانیاں ایک ہی نشست میں پڑھ لیں۔ ایک کہانی تو جیسے میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ کہانی کی ہیروئن، نوجوان کلارا ملچ، ایک مقامی نوجوان کی محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے لیکن وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کی بجائے وہ ایک احمق کی محبت میں گرفتار ہونے کے باعث خودکو سزا دینے کا فیصلہ کرتی ہے اور خودکو اس لت کا عادی بنا لیتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم نہیں، کیوں، لیکن مجھے اس لڑکی سے خاص طور پر قریبی وابستگی محسوس ہوئی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے حقیقی احساسات کا اظہار کرنے سے قاصر رہی اور کس طرح خوف اور رقابت نے اس کے اندر ہر گہری اور خوب صورت بات پر تسلط جما لیا...... اس میں مَیں نے خودکو دیکھا......

لیکن پھر میری زندگی برلن کے عجائب گھروں میں موجود مصوری کے قدیم اساتذہ کی تصاویر سے مزین اور مالامال ہوگئی۔ بعض مواقع پر، جب میں نیشنل گیلری میں کسی بھی تصویر پر گھنٹوں اپنی نظریں جمائے رکھتا تو پھر وہ چہرہ یا منظر کئی روز میرے تصور میں نقش رہتا۔

اب مجھے جرمنی آئے تقریباً ایک برس ہو چکا تھا۔ نومبر میں ایک تاریک اور برساتی دن...... مجھے کس قدر واضح طور پر یاد ہے...... میں اخبار کو کھنگال رہا تھا جب نئے مصوروں کے متعلق ایک مضمون میرے مشاہدے میں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ اس نئی نسل کو

کیا کہوں۔ شاید میں انہیں پسند نہیں کرتا تھا کیوں کہ ان کا کام بہت بے باک تھا اور آنکھوں تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر کہیں تک بھی جا سکتا تھا۔ پھر مجھے یوں ان مصوروں کی طرف سے بذاتِ خود اپنی ذات کی تشہیر کا عمل عجیب اور کراہت آمیز محسوس ہوا۔ اس لیے میں نے یہ مضمون پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ لیکن چند ہی گھنٹوں بعد جب میں شہر میں حسب معمول آوارہ گردی میں مصروف تھا، میں نے خود کو ایک ایسی عمارت کے سامنے کھڑے پایا جہاں نمائش منعقد ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے کوئی اور کام نہ تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں نمائش گاہ میں گھومتا اور بیگانگی سے چھوٹی اور بڑی سب تصاویر کا جائزہ لیتا رہا۔

ان میں سے اکثر نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا: ان تصاویر میں وہ لوگ دکھائے گئے جن کے کندھے اور گھٹنے تکونے، سر اور پستان غیر متناسب تھے جبکہ منظروں کو تیز رنگوں سے شکن آلود کاغذ پر مصور کیا گیا تھا۔ بلوریں صراحیاں ایسی بے شکل تھیں کہ جیسے ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی ٹھیکریاں ہوں، پھول ایسے بے جان تھے کہ جیسے انہیں کئی برس کتابوں کے اندر رکھا گیا ہو اور پھر وہ خوفناک شبیہ جو جرائم پیشہ افراد کے چہرے معلوم ہوتی تھیں...... لیکن پھر بھی لوگ خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاید میں نے ان مصوروں کو یہ سمجھنے پر مسترد کر دیا کہ وہ اس قسم کی معمولی کوشش سے بہت ارفع مقام حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن جب میں نے ان کی اس گھٹیا خوشی پر غور کیا جو وہ سزا پانے اور اپنا مضحکہ اڑانے کے باعث حاصل کر سکتے تھے، مجھے ان پر ترس آنے لگا۔

مرکزی کمرے کے دروازے کے قریب میں یکا یک رک گیا۔ یہ تمام برس گزر جانے کے باوجود بھی میں اس لہر کو بیان نہیں کر سکتا جو اس لمحے میرے بدن میں سرایت کر گئی تھی۔ اس وقت میں ایک ایسی خاتون کے تصویر کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا تھا جس نے کوٹ پہنا ہوا تھا۔ دیگر لوگ دوسری تصاویر کو دیکھنے کی جلدی میں میرے پاس سے گزرتے جا رہے تھے لیکن میں قطعی حرکت نہ کر سکا۔ اس پورٹریٹ میں ایسا کیا تھا؟ مجھے معلوم ہے کہ الفاظ ناکافی ہوں گے۔ میں اس وقت محض یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک انتہائی عجیب، پُرعزم اور تقریباً خوف انگیز تاثرات کی مالک تھی، ایسے تاثرات جو میں نے اس سے پہلے کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھے تھے۔ اگرچہ وہ چہرہ میرے لیے قطعی نیا تھا، میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اسے میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا

ہوں۔ یقیناً میں اس زرد چہرے، ان گہرے بھورے بالوں، ان سیاہ ابرو، ان سیاہ آنکھوں سے پہلے سے واقف تھا جن میں سے ایک ابدی دکھ اور عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اس خاتون کو اس وقت سے جانتا تھا جب میں نے سات برس کی عمر میں اپنی پہلی کتاب کھولی تھی...... جب میں نے پانچ برس کی عمر سے خواب دیکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے اس میں خالدضیا اُشک گل کی نہال، وجیہہ بے کی مہجورے اور Cavalier Buridan کی محبوبہ کی بازگشت دیکھی۔ میں نے قلوپطرہ کو دیکھا جسے میں تاریخ کی کتابوں سے جانتا تھا اور محمد ﷺ کی والدہ، آمنہ خاتون کو جن کو میں میلاد کی نعتیں اور دعائیں سننے کے بعد خواب میں دیکھتا تھا۔ وہ ان تمام کی خواتین کا مجموعہ تھی جن کا میں نے اب تک تصور کیا تھا۔ جنگلی بلی کی سمور میں ملبوس، وہ زیادہ تر تاریکی میں تھی لیکن زردی مائل سفید لمبی گردن اور بیضوی چہرہ قدرے بائیں طرف مڑا ہوا تھا۔ کہیں خلا میں دیکھتی اس کی سیاہ آنکھیں سوچ میں گُم تھیں، کسی شے کی تلاش میں کسی آخری امید میں جس کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ اسے کبھی حاصل نہ کر پائے گی۔ لیکن دکھ کے ساتھ اس میں کسی قسم کا چیلنج بھی تھا۔ یوں جیسے وہ کہہ رہی ہو: ''ہاں، مجھے علم ہے۔ میں اسے ہرگز حاصل نہ کر پاؤں گی جس کی مجھے تلاش ہے......اور اس چیز کی مجھے کیوں تلاش ہے؟'' یہی سب کچھ اس کے گداز ہونٹوں پر بھی تھا۔ نچلا ہونٹ قدرے بھرپور تھا۔ اس کے پپوٹے کچھ سوجے ہوئے تھے۔ اس کے ابرو گھنے اور نہ ہی پتلے، مگر مختصر سے تھے۔ گہرے بھورے بال، جو اس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے تھے، اس کے رخساروں اور پھر سمور سے بنے کوٹ تک آ رہے تھے۔ اس کی نوک دار ٹھوڑی قدرے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ناک ستواں جبکہ نتھنے پھیلے ہوئے تھے۔

نمائش کی تصویروں کی کتاب کی ورق گردانی کرتے میرے ہاتھ تقریباً کانپ رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ شاید میں اس تصویر کے متعلق کچھ مزید جان سکوں۔ صفحے کے آخر میں تصویر کے شمار نمبر کے ساتھ میں نے محض تین الفاظ لکھے دیکھے: ماریا، پوڈر، Selbstportrdt۔ اور کچھ نہیں۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اس تصویر کے خالق کی اس نمائش میں دوسری کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس بات پر میں ناخوش نہ تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ شاید اس کی دوسری تصاویر مجھ پر اس قدر بھرپور تاثر نہ چھوڑتیں اور یوں میری اوّلین تحسین میں کمی آجاتی۔ میں دیر تک وہیں ٹھہرا رہا۔ کبھی کبھار میں اٹھ

کھڑا ہوتا، گیلری میں گھومتا لیکن جلد ہی واپس آ جاتا اور اس تصویر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا۔ ہر دفعہ مجھے یہی محسوس ہوتا کہ مجھے اس کے چہرے پر نئے تاثرات دکھائی دیئے ہوں، جیسے وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹ رہی ہو۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس کی افسردہ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہیں اور اس کے ہونٹ مجھے لگا پھڑ پھڑا رہے تھے۔

آہستہ آہستہ گیلری خالی ہوتی گئی۔ میرے خیال میں، دروازے پر کھڑا طویل القامت شخص یقیناً میرا ہی منتظر تھا۔ جلدی سے میں اٹھا اور باہر نکل آیا۔ شہر پر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور پھر کسی دوسری طرف جانے کی بجائے میں نے سیدھا پنشن کا رخ کیا۔ میں نے رات کا کھانا جلدی جلدی کھایا اور اپنے کمرے میں گھس گیا تا کہ اس کا چہرہ اپنے تصور میں لا سکوں۔ کھانے کے دوران میں نے قطعی کوئی بات نہیں کی۔

''تم آج کہاں گئے تھے؟'' منتظمہ، فرو ہپنر نے پوچھا۔

''بس یونہی آوارہ گردی کرتا رہا۔'' میں نے کہا، ''اور اسی اثنا میں ایک ایسی گیلری پہنچ گیا جہاں جدید مصوری کی نمائش ہو رہی تھی۔''

میری یہ بات سنتے ہی میز پر موجود ہر شخص نے جدید مصوری کے متعلق گفتگو شروع کر دی جبکہ میں چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

جیکٹ اتارتے ہوئے اخبار میری جیب سے گر پڑا۔ میں اسے اٹھانے کے لیے نیچے جھکا اور جب میں اسے اپنی میز پر رکھ رہا تھا، میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اسی اخبار میں نمائش کے متعلق وہ مضمون چھپا تھا جسے میں نے آج صبح کیفے میں پڑھا تھا۔ میں نے یہ اخبار پورا کھول لیا تا کہ دیکھ سکوں کہ کیا اس اخبار میں اس مصور یا اس تصویر کے متعلق کچھ لکھا تھا۔ خود میں اپنے اس عجلت بھرے طرزِ عمل پر بہت حیران ہوا کیوں کہ درحقیقت میں ایک شریف، اور غیر جذباتی انسان تھا۔ میں نے یہ مضمون پڑھنا شروع کیا اور یکدم اس جگہ رک گیا جہاں وہ نام درج تھا جو میں نے اس سے پہلے تصویروں کی کیٹلاگ میں لکھا دیکھا تھا: ماریا پورڈ۔

یہ مدنظر رکھتے ہوئے کہ وہ اپنے کام کی پہلی بار نمائش کرنے والی ایک نوجوان مصورہ تھی، اس مضمون نے اسے خاصی توجہ دی۔ اس مضمون میں کہا گیا تھا کہ وہ مصوری کے عظیم اساتذہ

کے نقش قدم چلنے میں دلچسپی رکھتی تھی اور اس میں انسانی تاثرات کو مجسم کرنے کی نفیس، شان دار اور قابل تعریف صلاحیت موجود تھی۔ اپنی شبیہ یا پورٹریٹ بنانے والے دیگر مصوروں کے برعکس اس نے ''قطعی بدصورتی'' پیش کرنے سے انکار کر دیا جبکہ اس نے ''مبالغہ آمیز خوبصورتی'' دکھانے کی بھی کوشش نہ کی۔ چند تکنیکی معاملات کا ذکر کرنے کے بعد، ناقد نے اس پر اپنا مضمون ختم کیا کہ (کسی پُراسرار اتفاق کے باعث) تصویر میں موجود خاتون، تاثرات اور انداز واطوار، دونوں کے لحاظ سے Andrea del Sarto کی Madonna delle Arpie میں بنائی مدرمیری کی تصویر سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھی۔ ایک نیم مزاحیہ لب ولہجے میں اس نے 'Madonna in a Fur Coat' کے لیے کامیابی کی دعا کی اور بعدازاں وہ ایک اور مصور کے کام کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کی نظر سے گزرا تھا۔

اگلی صبح سویرے ہی میں اس دکان پر گیا جو Madonna of the Herpies کی دوبارہ تخلیق اور تلاش کے لیے مشہور تھی۔ مجھے اس دکان میں ایک بڑی البم بھی ملی جس میں Del Sarto کی تصاویر موجود تھیں۔ اگرچہ دوبارہ تخلیق کی گئی تصاویر زیادہ معیاری نہ تھیں جن سے ان کی اصلی تصاویر کا تاثر بھی نہ ملتا تھا، لیکن مجھے ناقد کی بات درست محسوس ہوئی۔ چبوترے پر کھڑی اپنے بازوؤں میں مقدس بچہ تھامے، میڈونا کی نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں جبکہ وہ اپنے دائیں طرف کھڑے باریش شخص اور بائیں طرف کھڑے نوجوان سے بے خبر تھی؛ اس کے سر کے خم اور اس کے چہرے اور اس کے ہونٹوں پر مجھے واضح طور پر کرب اور رنجیدگی کا وہی تاثر نظر آیا جسے میں ایک دن پہلے اُس پینٹنگ میں دیکھ چکا تھا۔ چوں کہ ان البموں کے صفحات الگ فروخت کیے جاتے تھے، میں دوبارہ تخلیق کردہ یہ پینٹنگ خرید کر اپنے کمرے میں لانے میں کامیاب رہا۔ یہ تصویر بغور دیکھنے کے بعد میں قائل ہو گیا کہ یہ انتہائی اعلیٰ قدر و قیمت کی حامل تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں واقعی میڈونا کو دیکھ رہا تھا۔ مدرمیری کے دیگر تمام اظہاریوں میں جو میں نے اب تک دیکھے تھے، اس کے چہرے پر معصومیت کا ایک ایسا تاثر تھا کہ جس کے باعث یہ کام بے سروپا نوعیت اختیار کر گیا تھا؛ ان تصاویر میں وہ کسی چھوٹی لڑکی کی حیثیت سے دکھائی گئی تھی جو اپنی بانہوں میں موجود بچے کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو، ''کیا تم نے دیکھا؟ تم نے دیکھا وہ تحفہ جو خدا

نے مجھے دیا ہے؟'' یا پھر ایک ایسی سرائے خادمہ جو بچے کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہی ہو۔

لیکن Sarto کی پینٹنگ میں مدر میری نے یہ سیکھ لیا تھا کہ سوچا کیسے جاتا ہے، اس نے اپنے نظریات تخلیق کر لیے تھے کہ کس طرح زندگی کی جائے، وہ بلاشبہ ایک عورت تھی، جس نے دنیا تج دینے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے دعا مانگتے اردگرد کھڑے بزرگوں اور اس مسیح کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کی جو اس کی بانہوں میں تھا۔ وہ تو آسمان کی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی؛ بلکہ اس کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور بلاشبہ اس نے وہاں کچھ دیکھ لیا تھا۔

تصویر میں نے اپنی میز پر رکھ دی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تصور کی نگاہ سے نمائش میں موجود تصویر کو دیکھنے لگا۔ اور عین اسی وقت مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ تصویر میں دکھائی گئی عورت کو واقعی اس دنیا میں موجود ہونا چاہیے۔ ہاں، بلاشبہ، یہ اس کی اپنی پورٹریٹ تھی! جس سے مراد یہ تھی کہ عورت کا یہ معجزہ ہمارے درمیان زندہ تھا جس کی کالی سیاہ آنکھیں زمین پر گڑی تھیں یا سامنے شخص پر تھیں، اس کے ہونٹ نیم وا تھے، اس کا نچلا ہونٹ دوسرے کی نسبت کچھ بڑا تھا...... وہ وجود رکھتی تھی! وہ زندہ اس دنیا میں موجود تھی! کہیں بھی، کسی وقت بھی، ممکن ہے کہ میری نظر اس پر پڑ جائے...... جب پہلی دفعہ یہ امکان مجھے محسوس ہوا، مجھ پر خوف کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میرے جیسے ایک ناتجربہ کار آدمی کے لیے یہ سوچنا بھی دہشت ناک تھا کہ اس کا سامنا ایسی عورت سے ہوگا۔

اگرچہ اس وقت تک میری عمر چوبیس برس ہو چکی تھی، مجھے عورت کے سلسلے میں کسی مہم جوئی کا موقع نہ ملا تھا۔ حاوران میں ہمارے گھر سے ملحقہ علاقے میں نشے میں دھت اور عیاش افراد کا ایک گروہ موجود تھا، جن کی مجھے کوئی سمجھ نہیں آتی تھی۔ میری فطری کم گوئی اور تنہائی پسند طبیعت نے اس قسم کی مہم جوئی کرنے سے مجھے باز رکھا تھا۔ واحد خواتین جنہیں میں جانتا تھا، وہی مخلوق تھیں جو میرے تصور میں ہمیشہ ہلچل مچاتی تھیں۔ ممکن تھا کہ وہ میرے ایک ہزار ایک خوابوں میں آتیں جنہیں میں مادی تفکرات سے بہت دُور شدید موسم گرما کی راتوں میں زیتون کے درختوں تلے لیٹے ہوئے دیکھتا لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک تھی: وہ سب میری رسائی سے باہر تھیں۔ بلاشبہ، میں اپنی ہمسائی فاہریے سے کئی برس تک چپکے چپکے محبت کرتا رہا۔ اپنے خوابوں میں، میں

نے ان بہت سی نامعقولیات کو دریافت کیا جو میرے لیے شرمساری کا باعث تھیں۔ جب بھی میں سڑک پر اس کے قریب سے گزرتا، میرا چہرہ اتنا سرخ ہو جاتا، میرا دل تیزی سے دھڑ کنے لگتا کہ میں اس سے خود کو چھپانے کے لیے خود کو جھکا لیتا۔ رمضان کی راتوں میں، میں گھر سے چپکے سے باہر نکل جاتا اور خود کو اس کے گھر کے سامنے والے دروازے پر پاتا کہ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ باہر نکلے جس کے ہاتھ میں لالٹین ہوتی تو میں اسے دیکھ سکوں۔ لیکن جیسے ہی دروازہ کھلتا، میں ہلکی زرد روشنی میں انہیں بمشکل ہی دیکھ پاتا کیوں کہ انہوں نے لمبے سیاہ کوٹ پہنے ہوتے۔ مڑتے ہوئے میں اس خوف سے کانپنے لگتا کہ وہ مجھے دیکھ لیں گی جب وہ نمازِ تراویح کے لیے جاتیں۔

اگر کبھی میرا سامنا کسی ایسی عورت سے ہوتا جو مجھے پُرکشش محسوس ہوتی تو سب سے پہلے مجھے یہی خیال آتا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ آمنا سامنا ہونے پر مجھے یہی خوف لاحق رہتا کہ میری نظر اور میری حرکت سے کہیں میرے حقیقی احساسات کا اظہار نہ ہو جائے۔ شرمساری میں مبتلا میں اس وقت دنیا کا انتہائی مصیبت زدہ انسان معلوم ہوتا۔ اپنی بلوغت کے زمانے میں مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی نظر اٹھا کر کسی لڑکی کو دیکھا ہو، حتیٰ کہ اپنی ماں کو بھی نہیں۔ بعدازاں جب میں استنبول آیا تو میں نے کوشش کی کہ میں اپنی اس مہمل شرم پر قابو پا سکوں؛ اپنے دوستوں کے ذریعے میں چند لڑکیوں سے ملا جن کے سامنے میں جیسا تھا ویسا ہی رہ سکتا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں نے ان میں اپنے لیے دلچسپی کا شعلہ بھڑکتے محسوس کیا، میرا تمام تر حوصلہ جواب دے گیا۔ میں ایسا معصوم بھی نہیں تھا؛ جب میں ان خواتین کو اپنے ذہن میں لاتا تو پھر میں اس قدر شاندار مناظر تصور کرتا کہ کوئی مشاق عاشق بھی انہیں بے باک محسوس کرتا، اور جب میں ان لڑکیوں کے سلگتے ہوئے ہونٹوں کا اپنے ہونٹوں پر تصور کرتا تو میں یوں مدہوش ہو جاتا کہ شاید میں اپنی حقیقی زندگی میں بھی ایسا مسحور نہ ہو سکتا۔

لیکن Madonna in Fur Coat کی پینٹنگ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا...... اس قدر کہ اسے ایسے منظر میں دیکھنے کا تصور بھی ناممکن تھا۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں دوست کی طرح اس کے برابر بیٹھنے کا بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں محض یہی چاہتا تھا کہ اس تصویر کے سامنے کھڑا ان سیاہ، نہ دیکھتی آنکھوں کو گھنٹوں دیکھتا رہوں۔ اور پھر میری یہ خواہش بڑھتی ہی چلی گئی۔

میں نے اپنا کوٹ پہنا اور واپس گیلری کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ میرا روزانہ کا معمول بن گیا۔

ہر سہ پہر میں گیلری میں تصاویر کا جائزہ لینے کے بہانے رکتا کیوں کہ میرے تجسس میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں تو محض یہی چاہتا تھا کہ سیدھا اپنی میڈونا کے پاس چلا جاؤں۔ جب بالآخر میں اس کے پاس پہنچ جاتا تو یوں ظاہر کرتا کہ جیسے میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اور میں وہاں اس وقت رہتا جب تک گیلری کے دروازے بند ہونے کے قریب ہوتے۔ جلد ہی پہریدار اور وہ چند فنکار بھی میرے شناسا ہو گئے جو اکثر اس گیلری میں آیا کرتے تھے۔ وہ کشادہ مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کرتے اور ان کی آنکھیں فن کے اس اجنبی پرستار کا پیچھا کرتیں۔ بالآخر میں نے اپنا کھلم کھلا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ میں سیدھا Madonna in Fur Coat کے پاس پہنچتا اور اس کے سامنے موجود چوبی لمبی نشست پر بیٹھ جاتا۔ اور پھر اس وقت تک اس پر ٹکٹکی باندھے رکھتا جب تک میری آنکھیں نہ تھک جاتیں اور پھر میں اپنی نگاہیں نیچے فرش پر جما لیتا۔

ناگزیر تھا کہ لوگ توجہ کرتے اور متجسس ہوتے۔ پھر ایک روز میرا بدترین خدشہ سچ ثابت ہو گیا۔ زیادہ تر فنکار جو اس گیلری میں اکثر آیا کرتے، وہ افراد تھے جنہوں نے ریشمی گلوبند پہنا ہوتا اور جن کے لمبے لمبے بال ہوتے جو ان کے سیاہ لباس پر لہراتے، لیکن ایک نوجوان خاتون بھی تھی جو گاہے گاہے ان میں شامل ہوتی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی ایک مصورہ تھی۔

ایک روز وہ میرے پاس آئی۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تم خاص طور پر اس تصویر سے بہت ہی متاثر ہو۔'' اس نے کہا، ''تم اسے روز دیکھنے کے لیے آتے ہو۔''

میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، یہ جانتے ہوئے کہ اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ہوگی۔ مزید کسی سوال سے خود کو بچانے کے لیے میں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ لیکن جیسے ہی میں نے اپنی نگاہیں نیچے کیں، مجھے نوکدار جوتے نظر آئے جو میری طرف سے وضاحت کے منتظر تھے۔ جب میری نگاہیں اوپر اٹھیں، میں نے دیکھا کہ وہ ایک مختصر سے سکرٹ میں ملبوس تھی اور اس کی ٹانگیں غیر معمولی حسین تھیں۔ اور جب بھی وہ حرکت کرتی، اوپر سے نیچے تک اس کے پورے سراپے میں ایک خوشگوار لہر پیدا ہو جاتی۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ اس وقت تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی جب تک وہ مجھ سے اپنے

جواب کا سوال نہیں حاصل کر لیتی، میں نے کہا: ''ہاں! یہ بہت خوبصورت تصویر ہے......'' پھر بوجوہ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی طرف سے کچھ وضاحت پیش کرنا چاہیے، میں نے جھوٹ گھڑا: ''یہ میری ماں کی طرح دکھائی دیتی ہے......''

''اوہ، شاید یہی وجہ ہے کہ تم یہاں آتے ہو اور دیر تک اسے دیکھتے رہتے ہو!''

''ہاں!''

''کیا تمہاری ماں مر چکی ہے؟''

''نہیں!''

اس نے ایک لحہ توقف کیا جیسے چاہتی ہو کہ میں بات جاری رکھوں۔ فرش پر بدستور نظریں جمائے، میں نے مزید کہا، ''وہ بہت دور رہتی ہے۔''

''اوہ......کہاں؟''

''ترکی میں۔''

''کیا تم ترک ہو؟''

''ہاں۔''

''مجھے معلوم تھا کہ تم غیر ملکی ہو۔''

مختصر سا قہقہہ لگاتے ہوئے وہ میرے ساتھ ہی لمبی چوبی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز و اطوار بہت ہی بے باک اور شوخ معلوم ہو رہے تھے۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے، اس نے ان کی واضح طور پر نمائش کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا ہو۔ میری بے بسی اور بے چینی سے خوب لطف اندوز ہوتے ہوئے، اس نے مجھ پر ایک اور سوال داغ دیا:

''کیا تمہارے پاس تمہاری ماں کی تصویر نہیں ہے؟''

میں سوچنے لگا کہ وہ کس قدر بے صبری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ یہاں محض میرا مذاق اڑانے آئی تھی۔ دیگر مصور ایک فاصلے سے ہمیں دیکھ رہے تھے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی محظوظ ہو رہے تھے۔

''میرے پاس ہے...... لیکن یہ کچھ دوسرا معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اوہ، تو یہ کوئی دوسرا معاملہ ہے؟'' اس نے میرے ہی الفاظ دہرا دیئے۔

یہ کہتے ہی اس نے ایک اور مختصر سا قہقہہ لگایا۔

میں نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے میں اس سے رخصت چاہتا ہوں۔ یہ محسوس کرتے ہوئے، وہ کہنے لگی: ''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی، میں جا رہی ہوں...... آؤ میں تمہیں تمہاری ماں کے ساتھ تنہا چھوڑ دوں۔''

وہ اٹھتے ہی چل دی۔ پھر یکا یک وہ مڑی اور میری طرف واپس آ گئی۔ اب اس کا لب ولہجہ پہلے سے کہیں مختلف تھا؛ اب اس کے لب و لہجے میں متانت اور سوگواری جھلک رہی تھی: ''کیا تم واقعی اس جیسی ماں چاہتے ہو؟''

''ہاں...... اوہ، ہاں، میری یہی خواہش ہے۔''

''اوہ......''

اس نے ٹہلتے ہوئے ایک دفعہ پھر میری طرف اپنی پشت کر لی جبکہ میں اپنی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے چھوٹے بال اس کی گردن کی پشت سے ٹکرا کر لہرا رہے تھے جبکہ اس کے ہاتھ جیبوں میں تھے، اور اس کے کوٹ کا کالر اس کے ہونٹوں کو چھو رہا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے کس طرح میرے آخری الفاظ نے ہماری پہلی گفتگو میں جھوٹ کو بے نقاب کر دیا تھا، میں نے اپنے اردگرد دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا یہاں سے چل دیا۔

اور پھر یوں مجھے خالی پن کا احساس ہوا کہ جیسے میں اپنے اس ہمسفر سے جدا ہو گیا ہوں جس پر میرا انحصار تھا۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اب اس گیلری میں، میں دوبارہ قدم نہیں رکھوں گا۔ لوگوں...... وہ لوگ جو ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں سمجھتے...... نے مجھے پرے دھکیل دیا تھا۔

پنشن کی طرف واپس لوٹتے ہوئے میں ان بے کیف ایام کے متعلق غور کرنے لگا جن کا اب مجھے سامنا کرنا تھا۔ جب بھی میں کھانے کی میز پر بیٹھتا تو متوسط طبقے کے لوگوں کو افراطِ زر کو کوستے سنتا جس نے ان کی خوش حالی چھین لی تھی، یا پھر ان کے مشورے کہ جرمنی کو کس طرح بچایا

جا سکتا تھا۔ ہر شب میں اپنے کمرے میں واپس جاتا اور ترگنیف یا تھیوڈر سٹارم کی کہانیاں پڑھتا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ گزشتہ پندرہ روز میں میری زندگی کو معنی ملنے لگے تھے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس سے محروم ہونے سے کیا مراد تھی۔ روشنی کی ایک شعاع مجھ پر ہوتی ہوئی گزر گئی تھی جس نے میری خالی زندگی کو ان امکانات سے بھر دیا تھا جنہیں میں کچھ اہمیت ہی نہیں دیتا تھا۔ لیکن اب، اسی پُراسراریت سے یہ غائب ہوگئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد تھا، میں نے ......شاید...... انجانے میں یا شاید کچھ تصور کرنے کی زحمت نہ کرتے ہوئے ...... کسی کی تلاش شروع کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں دوسروں سے احتراز کرتا رہا تھا۔ اگر ایک لمحہ کے لیے اس تصویر نے مجھے قائل کرلیا کہ میں اسے تلاش کرسکتا تھا تو میں اسے جلد تلاش کر لیتا۔ یوں مجھ میں امید کی ایک کرن پیدا ہوگئی تھی جو مایوسی میں کبھی تبدیل نہ ہوتی۔ دوسروں کی صحبت سے احتراز کر کے میں نے خود کو دنیا جہان سے الگ تھلگ کرلیا تھا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ جوش وخروش کے ساتھ اپنے اردگرد دنیا کی لعنت ملامت کرتا۔ اب میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اپنے والد کو لکھوں کہ میں واپس آنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس وقت میں کیا کہوں گا جب وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں نے یورپ میں کیا سیکھا؟ اس لیے میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں مزید چند مہینے یہاں قیام کروں اور محض ان کی خوشنودی کی خاطر خوشبودار صابن کی تجارت میں مہارت حاصل کروں۔ میں دوبارہ اسی سویڈیش کمپنی گیا، اگرچہ انہوں نے اس دفعہ میرا پہلے جیسا پُرتپاک استقبال نہیں کیا، انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ ہر روز جب میں فیکٹری جاتا، میں مستعدی سے نوٹس لیتا، طور طریقوں اور فارمولوں کو قلم بند کرتا۔ میں کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

جب میں واپس پنشن پہنچتا، ڈچ بیوہ فاؤ وین ٹیڈمن مجھے بہت توجہ دیتی۔ وہ بورڈنگ سکول میں پڑھنے والے اپنے نو سالہ بیٹے کے لیے لائے ناول مجھے عاریتاً پڑھنے کے لیے دیتی اور ان ناولوں کے متعلق میرے خیالات جاننا چاہتی۔ بعض اوقات رات کے کھانے کے بعد وہ کسی بہانے میرے کمرے میں آتی اور گھنٹوں میرے ساتھ گفتگو کرتی رہتی۔ اکثر اوقات وہ مجھ سے ان وارداتوں کے متعلق استفسار کرتی جو ممکنہ طور پر جرمن لڑکیوں کی ساتھ پیش آئی ہوں، اور جب میں اسے سچ بتاتا، وہ اپنی آنکھیں میچ کر اپنی انگلی ہوا میں لہراتی اور مجھے یوں معنی انداز سے دیکھتی کہ

جیسے کہہ رہی ہو، ''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے ...... مجھے علم ہے کہ تم جیسے نوجوان کیا کرتے پھرتے ہیں!'' ایک سہ پہر اس نے مجھے باہر چہل قدمی کی دعوت دی اور واپسی پر وہ مجھے ایک مے خانے لے گئی جہاں ہم نے اتنی پی لی کہ وقت کا خیال ہی نہ رہا۔ جب سے میں برلن آیا تھا، میں نے کبھی کبھار ہی بیئر پی تھی لیکن اس رات جتنی کبھی نہیں۔ سر چکرانے کے بعد میں نے خود کو فراوین ٹیڈمن کے بازوؤں میں دیکھا۔ جب کچھ دیر بعد میرے حواس درست ہوئے، یہ مہربان خاتون نیپکن سے میرا منہ صاف کر رہی تھی جو اس کے کہنے پر بیرے گیلا کر لائے تھے۔ میں نے اسے کہا کہ ہمیں اب گھر جانا چاہیے۔ وہ بل ادا کرنے پر اصرار کرنے لگی۔ جب ہم باہر نکلے، میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی میری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے ہم لڑکھڑاتے ہوئے کبھی آگے جاتے اور کبھی کسی دوسری طرف سے آتے لوگوں کے راستے پر جا پڑتے۔ چوں کہ رات بہت گہری ہو چکی تھی، اس لیے سڑکوں پر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ اور پھر، جب ہم سڑک عبور کر رہے تھے، ایک عجب واقعہ پیش آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے اس کا پاؤں سڑک کنارے موجود چھوٹے پتھروں میں الجھ گیا اور چوں کہ وہ بہت فربہ تھی، اس خاتون نے سنبھلنے کے لیے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا اور میں یہ سمجھا کہ وہ مجھ سے طویل القامت تھی، اس لیے اس کی بانہیں میری گردن میں آ الجھی تھیں۔ لیکن اپنے حواس بجا ہونے کے باوجود بھی وہ مجھ سے الگ نہیں ہوئی بلکہ اس نے مجھے مزید مضبوطی سے تھام لیا۔ اور چوں کہ میں نشے میں دھت تھا، مجھے اپنی حرکات پر قابو نہیں رہا تھا۔ اپنے بازو اس کے گرد ڈالتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس پینتیس سالہ خاتون کے پیاسے ہونٹ کسی جستجو میں تھے۔ اس کی گرم سانسیں میری سانسوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھیں اور اس کے ساتھ جذبات کی ایک تلخ مدہوش کن خوشبو۔ راہگیر ہمیں دیکھ کر ہنسنے اور ہمارے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرنے لگے۔ پھر جیسے ہی ہم دس قدم آگے چلے، میری نگاہ سٹریٹ لیمپ کی روشنی میں ایک ایسی خاتون پر پڑی جو ہماری طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں ششدر رہ گیا۔ جبکہ اس وقت فراوین ٹیڈمن مجھ سے لپٹی ہوئی تھی، اس کے ہونٹ میرے بالوں پر تھے اور میں اس سے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت میں بس اپنی طرف آتی اس عورت کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ وہی تھی۔ ایک ہی نظر میں بجلی کی تیزی سے میرے ذہن میں چھائی دھند صاف ہو گئی۔ بلاشبہ، یہ

وہی خاتون تھی؛ زرد چہرہ، لمبی ناک، سیاہ آنکھیں جبکہ وہ سمور میں لپٹی ہوئی تھی، میری فرکوٹ والی میڈونا۔ وہ اس وقت بہت ہی افسردہ اور دل شکستہ نظر آرہی تھی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر چلی جارہی تھی! لیکن جب اس نے ہمیں دیکھا، وہ استعجاب کے عالم میں رک گئی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور مجھے اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک جھلک نظر آئی۔ مجھے یوں جھرجھری آ گئی کہ جیسے مجھے تازیانہ پڑا ہو۔ اگرچہ اس وقت میں نشے میں دھت تھا، مجھے یہ ضرور محسوس ہوا کہ ان حالات میں ہماری یہ ملاقات کچھ زیادہ خوشگوار نوعیت کی حامل نہ تھی۔ اس کی مسکراہٹ نے اس کی فتح کو واضح کر دیا۔ بالآخر میں نے فراوین ٹیڈمن کی گرفت سے خود کو چھڑا لیا اور اس امید پر فرکوٹ والی میڈونا کے پیچھے لپک کر گیا کہ شاید میں اس تک پہنچ سکوں۔ اس بات سے بے خبر کہ میں اس سے کیا کہوں گا، میں تیزی سے اس کی طرف ہولیا۔ وہ جا چکی تھی۔ میں چند منٹ کے لیے وہاں کھڑا رہا اور اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتا رہا لیکن اب وہاں فراوین ٹیڈمن کے سوا کوئی نہیں تھا جو مجھ سے استفسار کر رہی تھی: ''تم یہاں کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے؟'' اس نے دوبارہ اپنے بازو میرے گرد ڈال دیئے اور اسی حالت میں مجھے پنشن واپس لے آئی۔ راستہ بھر اس نے مجھے مضبوطی سے پکڑے رکھا جب کہ اس کا چہرہ میرے چہرے سے مس ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے اب اس کی گرم سانس ناقابل برداشت اور جابرانہ لگی...... تاہم، میں نے مزاحمت ترک کر دی لیکن مجھے علم نہیں کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس وقت سب سے بہتر حل مجھے یہی نظر آیا تھا کہ میں بھاگ جاؤں لیکن اب اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت تو میں تین قدم بھی نہ اٹھا تا تھا کہ وہ عورت مجھے پھر بانہوں میں لے لیتی۔ اور اس کے ساتھ میں اس حیران کن ٹکراؤ پر استعجاب کے عالم میں تھا۔ جب الکوحل کے اثرت کم ہوئے، میں نے وہ سب یاد کرنے کی کوشش کی جو میں نے دیکھا تھا۔ لیکن وہ مسکراتی آنکھیں یوں دوبارہ غائب ہو چکی تھیں کہ جیسے خواب ہوں۔ نہیں، میرا خیال تھا کہ میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں اس سے اس قسم کے حالات میں ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جو میں نے دیکھا تھا، کیا ایک ڈراؤنا خواب تھا جس نے اس خاتون سے جنم لیا تھا جس نے مجھے اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا تا کہ وہ اپنے بوسوں اور گرم سانسوں سے میرا دم گھونٹ سکے...... اس وقت میں محض یہی چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے بستر پہنچ جاؤں، اپنے گھٹیا قسم کے خوابوں سے خود کو محفوظ کر لوں اور

نیند کو خود پر غلبہ پانے دوں۔ لیکن اس عورت کا مجھے چھوڑنے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہم پنشن کے جس قدر قریب پہنچے، اس کی گرفت اتنی ہی مضبوط اور جذباتی ہوتی گئی۔

سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے میری گردن میں اپنی بانہیں پھر سے ڈال لیں۔ کسی طور میں خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا اور سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کی۔ اس کے بھاری بدن کے بوجھ سے سیڑھیاں بھی ہلنے لگیں، اس نے ہانپتے ہوئے تیزی سے میرے پیچھے آنے کی کوشش کی۔ جب میں جیب میں اپنی چابی ٹٹول رہا تھا تو استعماری، ہیر دوپکے راہداری کے دوسرے کونے سے نمودار ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ تبھی مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہماری واپسی کا منتظر تھا اور میں نے ایک گہری سانس بھری۔ اس عمارت میں موجود ہر شخص جانتا تھا کہ یہ شخص (جو خاصا خوشحال تھا) بیوہ کے لیے پسندیدگی کے احساسات رکھتا تھا جس میں جذبات کے شعلے ابھی تک بھڑک رہے تھے۔ بلاشبہ، فراوین ٹیڈمن، اس کی محبت سے بالکل بھی بے خبر نہیں تھی اور یہ افواہ بھی سننے میں آئی تھی کہ وہ بھی اس لحیم شحیم بوڑھے کنوارے میں دلچسپی رکھتی تھی، جس کی زندہ دلی اس بات کو جھوٹ ثابت کرتی تھی کہ اس کی عمر پچاس برس تھی۔ ایک دوسرے سے نظر ملتے ہی دونوں دوست کچھ فاصلے پر رک گئے۔ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہونے میں قطعاً تاخیر نہیں کی اور اندر سے دروازہ مقفل کر لیا۔ سرگوشیوں میں گفتگو شروع ہو گئی جو کچھ دیر جاری رہی۔ محتاط سوالات محتاط جوابات، ان لوگوں کی سماعت کی تسکین کا باعث تھے جو سمجھنے کے مشتاق تھے۔ پھر کافی دیر بعد مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی جس کے ساتھ راہداری میں سرگوشیاں بھی گونج رہی تھیں۔

جیسے ہی میرے سر نے تکیے کو چھوا، نیند نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ سورج طلوع ہونے تک میں ایک ایسا ڈراؤنا خواب دیکھتا رہا جس میں فرکوٹ والی میڈونا روپ بدل بدل کر میرے سامنے آتی رہی، وہ اپنی قاتل مسکراہٹ سے مجھے کچل دیتی۔ اس دوران میں نے کچھ کہنے، کچھ وضاحت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی موجود روشنی نے مجھے گونگا کر دیا۔ اس نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا تھا اور میرے پاس مایوسی کا اظہار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے میں بیدار ہو گیا۔ میرے سر میں درد تھا۔ میں نے لیمپ روشن کیا اور کچھ پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن یوں جیسے سطریں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور

اس دھند لکے میں دو سیاہ آنکھیں میری بے بسی پر ہنس رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی آنکھیں تھیں جنہیں میں نے محض اپنے تصور میں ہی دیکھا تھا۔ میں خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا۔ میں نے لباس پہنا اور باہر نکل گیا۔ یہ برلن کی ٹھنڈی اور مرطوب صبح تھی۔ سڑکوں پر اشیا کی تقسیم پر مامور لڑکوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا جو دودھ، مکھن اور روٹیوں کو اپنی دستی گاڑیوں پر لادے آجا رہے تھے۔ موڑ مڑتے ہوئے میں نے ایک پولیس اہلکار کو دیکھا جو انقلابی پوسٹر پھاڑ رہا تھا جو کسی نے رات دیواروں پر چسپاں کر دیئے تھے۔ نہر کنارے چلتے ہوئے میں ٹیر گارٹن پہنچ گیا۔ دو بگلے ساکت پانیوں پر بے حس و حرکت کھلونوں کی طرح تیر رہے تھے۔ جنگلوں میں درختوں کی شاخیں اور بنچ بھیگ چکے تھے۔ ایک بنچ پر ایک مڑا تڑا اخبار اور کئی ایک ہیر پنیں پڑی تھیں جنہوں نے مجھے گزشتہ رات کی یاد دلا دی۔ فاؤ وین ٹیڈمین نے بیئر ہال سے واپسی پر کئی پنیں گرا دی تھیں اور اب ممکنہ طور پر وہ اپنے ہمسائے ہیر ڈوپکے کے ساتھ ہنسی خوشی دراز ہو گی اور سوچتی ہو گی کہ ملازماؤں کے آنے سے پہلے کس طرح وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں واپس چلی جائے۔

فیکٹری معمول سے قدرے پہلے پہنچتے ہوئے میں نے پہریدار کو گرم جوشی سے سلام کیا۔ اب میں خود کو کام میں پوری طرح منہمک کر لیتا، یوں خود کو اس خوف سے آزاد کرواتے ہوئے جن کا سزاوار میری بے کار زندگی نے مجھے ٹھہرایا تھا۔ میں خوشبودار صابن کی ٹکیوں کے قریب بیٹھ جاتا۔ گلاب کی خوشبو کو اپنے سانسوں میں بساتے ہوئے میں اپنے روزنامچے میں ضروری معلومات درج کرتا رہتا۔ جب میں ان فیکٹریوں کے نام اپنے پاس درج کر رہا ہوتا جہاں خوشبودار صابن بنتا تھا تو پھر میں بھی خود کو حاوران میں خوشبودار صابن سازی کی ایک بڑی اور جدید فیکٹری کا مینیجر سمجھتا جو ترکی میں بہت مشہور ہوتی۔ میں اپنے تصور میں انڈے کی شکل کے خوشبوردار گلابی صابن کا تصور کرتا جو ایک نرم اور خوشبودار کاغذ میں لپٹا ہوتا اور اس پر محمود راعف، حاوران تحریر ہوتا۔

سہ پہر تک میرے اس جوش میں اضافہ ہو جاتا کیوں کہ آخر کار میں ایک روشن مستقبل کے متعلق تصور کر سکتا تھا۔ کافی عرصہ سے میں یونہی پریشان تھا، میں کبھی اپنے مستقبل کے متعلق حسین خوابوں میں کھو جاتا اور کبھی اپنے خود ساختہ خدشات میں گرفتار ہو جاتا۔ لیکن اب مجھ میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ اب میں اپنے مطالعے کو ان کتب تک محدود کر رہا تھا جو مجھے اس پیشے میں مدد فراہم

کرتیں۔میری طرح کسی خوشحال گھرانے میں پیدا ہونے والے کسی شخص کو خوشی کی تلاش کیوں نہیں کرنی چاہیے؟

میں اپنے باپ کے زیتون کے باغات کا مالک تھا، حاور ان میں دو فیکٹریاں اور صابن کا کاروبار میرے منتظر تھے۔میری دو بڑی بہنیں، جن کی شادی دولت مند مردوں سے ہوئی تھی، اس کاروبار میں حصہ دار ہوتیں اور میں ایک معزز اور قابل احترام بزنس مین کی زندگی بسر کرتا۔ترک فوج نے دشمن قوتوں کو نکال باہر کیا تھا اور حاروان آزاد تھا۔اپنے خطوط میں میرے بابا حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہوتے تھے۔برلن میں بھی ہم نے ترک سفارت خانے میں فتح کا جشن منایا۔کبھی کبھار میں اپنے خول سے باہر نکلتا اور ڈوپکے اور بے روزگار افسروں کو جرمنی کو بچانے کے مشورے دیتا۔میں نے خود کو یقین دلا دیا تھا کہ یہاں جینے کی ہر شے موجود تھی۔بے معنی پینٹنگ کے متعلق خوامخواہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی جو محض کتابوں کے کرداروں سے متاثر ہوکر بننے والا ایک تخیل تھی؟نہیں، اب سے میں خود کو بدلنے والا تھا......

لیکن رات ہونے تک میرا تمام جذبہ ماند پڑ گیا۔رات کے کھانے پر فاؤ وین ٹیڈ مین کے سامنے سے احتراز کی خاطر میں نے کھانا باہر کھانے کا فیصلہ کرلیا اور بیئر کے دو گلاس پی لیے۔ لیکن اپنی بھرپور کوشش کے باوجود میں اٹھ نہ سکا۔مجھے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے کوئی چیز میرے دل پر دباؤ ڈال رہی تھی۔یہ سوچتے ہوئے کہ تازہ ہوا میں چہل قدمی میرے مزاج کو بہتر کردے گی، میں نے بل طلب کیا۔آسمان دوبارہ ابر آلود ہو گیا تھا اور اب بوندا باندی ہو رہی تھی۔نیچے اترے بادلوں پر میں شہر کی روشنیوں کی ارغوانی جھلک بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔چہل قدمی کرتے ہوئے میں کرفرسٹنڈم نامی ایک طویل چوڑی سڑک پر پہنچ گیا۔یہاں سے پورا آسمان روشن نظر آرہا تھا، بارش کی بہتی بوندوں پر شہر کی نارنجی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔اس سڑک پر کیسینو، تھیٹر اور سینما، قطار اندر قطار واقع تھے۔بارش سے بے پروا لوگوں کے ہجوم ٹہل رہے تھے۔میں بھی ان میں شامل ہو گیا جبکہ میرے ذہن میں مختلف خیالات گردش کررہے تھے۔مجھے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے میں خود کو ایک ایسے خیال سے آزاد کرانے کی کوشش کررہا تھا جس نے مجھے اپنا قیدی بنا رکھا تھا۔میں چہل قدمی کرتے ہوئے مختلف قسم کے روشن اشتہاری بورڈ پڑھتا جارہا تھا۔چلتے چلتے میں

اس چوڑی سڑک کے آخری کنارے تک پہنچ گیا جو کئی کلومیٹر طویل تھی۔ پھر میں دائیں مڑا اور وٹن برگ سکوئر کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہاں مجھے سرخ بوٹ پہنے نوجوانوں کی ایک جماعت ملی جنہوں نے چہروں کو خواتین کی طرح رنگا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر واقع ایک بڑے سٹور KaDeWe کے باہر راہگیروں پر عشوہ گرانہ نگاہیں ڈالتے منڈلا رہے تھے۔ میں نے جیب سے اپنی گھڑی نکالی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ پہلے ہی تاخیر ہو چکی تھی۔ اس لیے نولندروف سکوئر تک مختصر فاصلہ طے کرنے کی خاطر میں نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ اب مجھے یہ خوبی علم تھا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ میں اُسی جگہ جا رہا تھا، جہاں گزشتہ شب، عین اسی وقت، میری ملاقات فرکوٹ والی میڈونا سے ہوئی تھی۔ یہ چوک اس وقت ویران تھا جبکہ چند ایک پولیس اہلکار شمالی طرف ایک تھیٹر کے باہر کھڑے تھے۔ سڑک عبور کرتے ہوئے میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں میں فاؤ وین ٹیڈ مین کے ساتھ لڑکھڑا اور ڈگمگا رہا تھا۔ میں نے لیمپ پوسٹ پر اپنی نظریں جما لیں کہ شاید اس تنہا رات میں ایک ایسی خاتون یہاں آ جائے جسے دیکھنے کی مجھے حسرت تھی۔ اس بات کا قائل ہونے کے باوجود کہ جو کچھ میں نے گزشتہ رات دیکھا، محض وہم تھا، ایک ایسا وہم جو نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں اب یہاں تھا اور اس خاتون کا منتظر جو شاید محض واہمہ تھی۔ صبح سے جن فیکٹریوں کو میں تصور میں دیکھا رہا تھا، وہاں محض ہوا تھی۔ ایک بار پھر میں نے خود کو اپنے تخیل کا قیدی محسوس کیا اپنے خود ساختہ جہان میں مقید۔

پھر میں نے کسی کو چوک سے گزر کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ ایک گھر کے دروازے میں چھپتے ہوئے میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ جھانکنے پر مجھے معلوم ہو گیا کہ میڈونا نپے تلے قدموں سے میری طرف آ رہی تھی۔ اس دفعہ مجھے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اس وقت میری حالت انتہائی پُرسکون تھی۔ خالی سڑک اس کے جوتوں کی ٹک ٹک سے گونج رہی تھی۔ میرا دھڑکتا ہوا دل اس طرح سکڑ رہا تھا کہ جیسے چھاتی پر دباؤ بڑھ رہا ہو۔ چاپ اب مزید نزدیک آ رہی تھی۔ سڑک کی جانب اپنی پشت کرتے ہوئے میں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے میں دروازے کو ٹٹول رہا ہوں اور یوں جھکا جیسے ایک لمحے میں ہی یہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاؤں گا۔ یہ سب کچھ میں اس لیے کر رہا تھا کہ اپنے پیچھے اس کے قدموں کی چاپ رکتے سن کر چیخنے نہ لگ جاؤں یا گر نہ پڑوں۔ میں دیوار کے

ساتھ چپک گیا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب سے گزری، میں دروازے سے نکل کر اس کے پیچھے ہولیا اور اس کے قریب ہی رہا تا کہ اب کی بار میں اسے کھونہ دوں۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن یہاں تھا میں...... ایک ایسا شخص جو اسے محض دوبارہ دیکھنے پر دہشت محسوس کر رہا تھا...... اس سے محض پانچ یا چھے قدم پیچھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر میں یہاں واپس کیوں آیا تھا، کیوں اس کا منتظر تھا، اگر مجھے چھپنا ہی تھا تو؟ اور اب میں اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا؟ کیا واقعی وہی تھی؟ میں یہ کیوں کر یقین کر سکتا تھا کہ ایک عورت رات کے کسی وقت ایک خاص وقت ایک مخصوص سڑک پر عین اسی جگہ سے گزر رہی ہو جہاں سے وہ ٹھیک چوبیس گھنٹے پہلے گزری تھی؟ میں ان میں سے کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہ تھا جبکہ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا حالاں کہ ہر قدم پر مجھے یہ خدشہ محسوس ہوتا کہ وہ اچانک مڑ کر مجھے دیکھ لے گی۔ میں اس کی چاپ کا پیچھا کرتے سر جھکائے، نظریں سڑک پر جمائے چلتا رہا۔ اچانک اس کے جوتوں کی ٹک ٹک غائب ہو گئی، میں رک گیا۔ میرا سر مزید جھک گیا اور میں کسی قیدی کی طرح دکھائی دیا۔ لیکن کوئی بھی میری طرف نہیں آیا، کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا: ''تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟'' چند ثانیے بعد میں نے دیکھا کہ میرے قدموں کے اردگرد کی زمین روشن ہو چکی تھی۔

میں نے آہستہ آہستہ اپنا سر اٹھایا، وہ خاتون مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میرے آگے چند قدم کے فاصلے پر اٹلانٹک نامی کیبرے کا روشن دروازہ نظر آیا۔ اس پر ایک بڑے روشن بورڈ پر اس کا نام نیلی روشنیوں میں دمک رہا تھا جو نیلی برقی لہروں کے باعث پیدا ہو رہی تھیں۔ دروازے پر تقریباً دو میٹر لمبا ایک شخص کھڑا تھا جو موتیوں سے سجا لباس اور سرخ ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ عورت بھی اندر ہو گی۔ ایک لمحہ توقف کیے بغیر میں اس شخص کے پاس گیا اور سرگوشی میں استفسار کیا: ''کیا فر کوٹ میں ملبوس کوئی خاتون مجھ سے پہلے اندر گئی ہے؟''

دربان بھی میری طرف جھک آیا اور بولا، ''ہاں۔'' اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

کیا اس خاتون کا معمول یہی ہے؟ میں نے سوچا۔ اگر وہ ہر شب اسی وقت یہاں آتی تھی تو پھر وہ یہی خاتون ہو سکتی تھی۔ گہرا سانس بھر کر پُرسکون ہوتے ہوئے میں اپنا کوٹ اتارنے لگا اور اندر چلا گیا۔

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہال کے وسط میں دائرے کی طرز کا ڈانس فلور تھا اور اس کے عقب میں آرکسٹرا تھا جبکہ دیواروں کے ساتھ پرائیویٹ باکس کی قطاریں تھیں۔ اکثر کے پردے تقریباً کھنچے ہوئے تھے اور جوڑے رقص کے بعد اپنے کمروں کو واپس جاتے، پردے کھینچ دیتے۔ ایک میز کے پاس سے گزرتے ہوئے جو خالی معلوم ہوتی تھی، میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بیئر لانے کا حکم دیا۔ اب میرا دل بالکل پُرسکون تھا۔ میں نے منظر پر نظر ڈالی۔ مجھے امید تھی کہ میں اسے تلاش کر پاؤں گا...... فرکوٹ والی میڈونا جس نے مجھے ہفتوں سے بے خوابی میں مبتلا کر رکھا تھا...... کسی میز پر کسی ہرجائی نوجوان یا بوڑھے شخص کے ساتھ بیٹھے ہوئے۔ جب مجھے اس خاتون کے متعلق کچھ اندازہ لگانے کا وقت ملتا...... جسے میں منڈی میں خود کو پیش کرتے ہوئے دیکھ لیتا...... تو میں اس سے آزاد ہو جاتا۔ میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ میں نے خود کو لعنت ملامت کی کہ میں لوگوں کی اصلیت نہیں پہچان سکا تھا۔ اگرچہ میں نے اپنی زندگی کی چوبیس بہاریں دیکھ لی تھیں، میں نے خود کو بچپن کی معصومیت سے آزاد نہیں کیا تھا۔ میں تو ایک سادہ سی پینٹنگ سے بھی متاثر ہو گیا تھا جو اس قدر خوب بھی نہ تھی۔ میں نے زرد چہرے پر اتنے بہت سے احساسات پڑھ لیے تھے جو کسی لائبریری کو بھرنے کو کافی ہوتے، میں نے اس چہرے میں ایسی خصوصیات تلاش کر لی تھیں جن کی موجودگی کا امکان تک نہ تھا بلکہ ایسا ہونا ناممکن تھا۔ لیکن اب میں نے اسے اپنی عمر کی دیگر عشوہ طراز لڑکیوں کی طرح اس چمکتے دمکتے کیبرے میں بنیادی مسرتوں کو تلاش کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ فرکوٹ میں ملبوس میڈونا، جسے میں نے بہت عزت دی تھی، ایک عام اور معمولی گاہک کے سوا کچھ نہیں تھی۔

میں نے ان پرائیویٹ باکس پر پوری نظر رکھی ہوئی تھی اور آنے جانے والوں کو بغور دیکھ رہا تھا؛ نصف گھنٹے کے اندر میں نے ان باکس میں مقیم تمام جذباتی جوڑوں کو دیکھ اور پرکھ لیا تھا۔ واضح طور پر فرکوٹ والی میڈونا ان میں سے کسی باکس میں نہیں تھی۔ جیسے ہی کسی باکس کا پردہ

ہٹتا، میں جھانک کر دیکھ لیتا لیکن میں نے کسی کو اکیلا بیٹھے نہیں دیکھا جبکہ کوئی جوڑا ابھی تک رقص کرنے کے لیے نہیں آیا تھا۔

ایک دفعہ پھر میرے اعصاب میرے قابو سے باہر ہو گئے۔ کیا جس عورت کے تعاقب میں، میں یہاں آیا تھا، کوئی واہمہ تھی؟ بلاشبہ سارے برلن میں وہ واحد خاتون نہیں تھی جو فر کوٹ میں ملبوس ہو۔ میں نے تو اس کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا۔ کیا میں واقعی محض چال سے کسی خاتون کو پہچاننے کا دعویٰ کر سکتا تھا؟ ایک ایسی عورت جس نے اپنی مسکراہٹ سے تب میرا مضحکہ اڑایا جب اس نے مجھے نشے میں دھت دیکھا تھا؟ اگر میں اسے واقعی دیکھ پاتا۔ میں آج دن بھر اسی کا تصور کیے ہوئے تھا؟ ایک نئے خطرے میں گرفتار ہوتے ہوئے میں نے سوچا کہ میرے ساتھ کیا بیت رہی تھی۔ کس طرح اور کیوں اس پینٹنگ نے مجھے اپنی گرفت میں لیا تھا؟ یہ خیال کہ میں یہ یقین کر سکتا تھا کہ یہ وہی عورت تھی جو اس رات کے گہرے اندھیرے میں میرے قریب سے گزری تھی! یہ سوچنا کہ میں نے محض اس کے قدموں کی چاپ اور اس کے فر کوٹ کے باعث اس کا تعاقب کیا تھا! اب میرے پاس کوئی دوسرا چارا نہیں تھا کہ میں یہ جگہ چھوڑ دوں اور بعد ازاں خود پر کڑی نظر رکھوں۔

عین اسی لمحے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ دھیمی سی روشنی آرکسٹرا پر پڑ رہی تھی۔ ڈانس فلور خالی ہو چکا تھا اور پھر کچھ دیر بعد مدھم اور خوش آہنگ گیت کی دھنیں سنائی دینے لگیں۔ دوسری طرف سے میں وائلن کی اٹھتی باریک افسردہ دھن سن سکتا تھا۔ سفید مختصر سکرٹ اور کھلے گلے کے لباس میں ایک لڑکی ڈانس فلور پر آئی جو وائلن بجا رہی تھی۔ اس قدر گمبھیر آواز میں جو کسی مرد کی محسوس ہوتی تھی، اس نے اس وقت کا کوئی مقبول نغمہ گانا شروع کیا۔ ایک پروجیکٹر سے آتی روشنی کا بیضوی ہالہ فرش پر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

میں نے اسے صاف پہچان لیا۔ معمہ حل ہو چکا تھا...... اور میرے اندازے بکھر گئے۔

اوہ، میرے دل کو کس قدر ٹھیس پہنچی! اسے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹیں سجائے افسردگی کے عالم میں عشوہ گری کرتے ہوئے دیکھنا کس قدر افسوس ناک تھا!

میں پینٹنگ والی اس لڑکی کو انداز بدلتے بلکہ ہر کسی کی آغوش میں جاتے تصور کر سکتا

تھا۔لیکن کچھ بھی مجھے اسے اس حالت میں دیکھنے پر تیار نہ کر سکا۔وہ کس قدر قابل رحم دکھائی دے رہی تھی۔میرے خوابوں کی میڈونا کا غرور، طاقت اور سرکشی کہاں گئی تھی؟

''بہتر یہی ہوتا کہ میں اسے اسی حالت میں دیکھتا جیسا کہ میں نے کچھ دیر پہلے تصور کیا تھا۔'' میں نے خود کلامی کی، ''کہ وہ مردوں کے ساتھ نشے میں دھت ہے،ان کے ساتھ رقص اور بوس وکنار کر رہی ہے۔'' کیوں کہ اگر ایسا ہوتا،تو وہ کچھ بھی اپنی مرضی سے نہ کر رہی ہوتی۔خود کو فراموش کرتے ہوئے اور حالات کی رو میں آ کر......اب،اگرچہ میں اب واضح طور پر دیکھ سکتا تھا کہ اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جو وہ کر رہی تھی۔جس انداز سے وہ وائلن بجا رہی تھی،اس میں کوئی غیر معمولی پن نہ تھا لیکن اس کی آواز خود اس سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی، یا پھر اس کی آواز میں درد سمٹ آیا تھا۔اس کے ہونٹوں سے حسرتوں سے لبریز نغمے نکل رہے تھے کہ جیسے وہ کسی مخمور لڑکے کے گیت ہوں۔وہ مسکراہٹ جو اس نے اپنے ہونٹوں پر سجائی تھی......محض ایک لکیر......جیسے وہ مایوسی کے عالم میں فرار حاصل کرنا چاہتی ہو، جب وہ کسی گاہک کے کانوں میں نغمے کے کوئی بول کہتی،وہ ایک میز سے دوسری میز کی طرف حرکت کرتی،اس کا چہرہ یکا یک سخت ہو جاتا اور وہ اپنے تاثرات یوں بدل لیتی کہ جس طرح میں پینٹنگ میں دیکھ چکا تھا۔کسی کو دنیا تیاگ کر مسکرانے پر مجبور دیکھنے سے زیادہ مجھے دکھی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔جب وہ ایک میز پر پہنچی، نشے میں دھت ایک مرد لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی برہنہ کمر کا بوسہ لیا۔وہ اس طرح کانپی کہ جیسے سانپ نے اسے کاٹ لیا ہو لیکن سرد لہر جو اس کے بدن میں دوڑ گئی تھی،ایک لمحہ میں غائب ہو گئی۔وہ مڑی اور مدہوش مرد کی دیکھ کر یوں مسکرائی کہ جیسے کہہ رہی ہو: ''اوہ،تم کس قدر پیارے ہو!'' پھر اس کے پاس بیٹھی عورت کی طرف مڑی، جو اپنے ساتھی سے ناراض معلوم ہو رہی تھی،اپنا سر یوں ہلایا کہ جیسے کہہ رہی ہو: ''جانے دو مادام،مرد تو ایسے ہی ہیں،ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں؟''

ہر نغمے کے بعد حاضرین کی طرف سے تالیاں بجا کر اسے داد وتحسین دی جاتی اور پھر، یہ خاتون اپنا سر ہلا کر آرکسٹرا کو دوسرا نغمہ شروع کرنے کا اشارہ کرتی۔پھر وہ ایک ایسی آواز میں نغمہ سرا ہوتی جو برہمی اور اشتعال سے بھرائی ہوتی اور ایک سے دوسری میز کی طرف حرکت کرنے کے دوران اس کا لمبا سفید لبادہ فرش پر پھسلتا جاتا۔ایک ایسی میز پر رکتے ہوئے جہاں مدہوش

جوڑا ہم آغوش ہوتا یا پھر جب پرائیویٹ باکس کے کھچے ہوئے پردوں کے قریب، وہ اپنا وائلن اپنے ٹھوڑی کے نیچے کر لیتی اور اپنی قدرے بے ڈھنگی انگلیوں سے اس کے تاروں سے کھیلنے لگتی۔

جب میں نے اسے اپنی میز کی طرف آتے دیکھا، مجھے ایک دہشت ناک گھبراہٹ نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اس کا سامنا کیسے کر سکتا تھا؟ میں کیا کہہ سکتا تھا؟ پھر میں اپنے سوال کی مہمل پن پر خود ہی ہنس پڑا۔ کیا میں واقعی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے کسی ایسے شخص کی حیثیت سے پہچان لے گی جس کے پاس سے وہ گزشتہ رات کی تاریکی میں گزری تھی؟ اس کے نزدیک میری حیثیت محض ایک ایسے نوجوان کی ہو سکتی تھی جو یہاں زندہ دل اور خوش باش ساتھیوں کے ساتھ تفریح کرنے آیا تھا! تاہم، میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے لبادے کی سنجاف گردسی اٹی ہوئی تھی کیوں کہ یہ لبادہ اس کی ہر حرکت کے ساتھ فرش پر اس کے ساتھ ہی پھسلتا جاتا۔ جب میں نے چوری چوری اس کے لبادے میں سے جھانکا تو مجھے محض ایک کھلا سفید جوتا ہی دکھائی دیا۔ اس کے پاؤں برہنہ تھے۔ پروجیکٹر کی سفیدی مائل روشنی میں مجھے اس کے پاؤں، پنجے کے بالائی حصے پر باریک گلابی نشان نظر آیا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے تصور میں اسے مکمل طور پر برہنہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے شرم سے اپنا سر اٹھا لیا۔ اس نے دیدہ ودانستہ مجھ پر اپنی نظریں جما رکھی تھیں جبکہ اس نے گانا بند کر دیا تھا اور محض وائلن سے کھیل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے مصنوعی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں گواہ تھیں کہ وہ میری موجودگی کا خیرمقدم کر رہی تھی۔ بالکل ایسا ہی تھا۔ کسی بھی دکھاوے اور اپنے ہونٹ ہلائے بغیر وہ کسی پرانے دوست کی مانند میرا استقبال کر رہی تھی۔ صرف اس کی آنکھیں ہی مجھ سے مخاطب تھیں جن کا مطلب میں صاف سمجھ رہا تھا۔ اس دفعہ مجھے علم تھا کہ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اس نے مجھ پر مسکراہٹ اچھالی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس نے اس کا تمام چہرہ روشن کر دیا...... کشادہ، خالص اور کھری۔ وہ مجھے دیکھ کر یوں مسکرائی تھی کہ جیسے میں اس کا کوئی پرانا دوست ہوں...... مزید کچھ دیر تک وائلن کے تاروں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پھر اپنے سر سے اشارہ کیا اور اپنی آنکھوں سے مجھے الوداع کہہ کر اگلی میز کی طرف بڑھ گئی۔

عین اس وقت مجھ پر اس خواہش نے غلبہ پا لیا کہ میں لپک کر جاؤں اور اس کی گردن

میں اپنی بانہیں ڈال دوں، اس کے ہونٹوں پر بوسہ دوں اور آنسوؤں کو بہنے دوں۔ اس سے پہلے مجھے اس قسم کی خوشی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ میں یہ محسوس کررہا تھا کہ پہلی دفعہ میرا دل کسی کے لے وا ہو رہا تھا۔ کیوں کر تھا کہ کوئی شخص کچھ بھی کیے بغیر دوسرے شخص کو خوشی سے سرشار کر دے؟ ایک دوستانہ استقبال، ایک معصوم مسکراہٹ...... اور اس لمحے میں اس کے علاوہ کسی بھی چیز کا خواہشمند نہیں تھا۔ اب میں دنیا کا دولت مندترین شخص بن چکا تھا۔ کمرے میں اپنی آنکھوں سے اس کا طواف کرتے ہوئے میں نے خودکلامی کی، ''تمہارا شکریہ...... تمہارا بہت شکریہ۔'' اب مجھے ادراک ہو گیا تھا کہ میں نے اس پینٹنگ میں سچائی دیکھ لی تھی۔ وہ بالکل حقیقی لیکن میرے تصور کے عین مطابق تھی۔ اگر یوں نہ ہوتا، کیا وہ مجھے کبھی پہچان سکتی، یا مجھے اس قدر گرم جوشی سے خوش آمدید کہہ سکتی تھی؟

لیکن پھر مجھے شک کی ناگن ڈسنے لگی: شاید اس نے مجھے کوئی دوسرا شخص سمجھا ہو۔ یا پھر شاید اس رات مجھے اس قدر بری حالت میں دیکھنے کے بعد، اس کا خیال ہو کہ وہ مجھے جانتی ہے اور یوں اس نے مجھے خوش آمدید کہا ہو؟ لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیں نہیں دیکھیں، ایک تعلق خاطر پیدا کرنے کی خاطر اس میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دیکھی۔ اس نے مجھے بھرپور اعتماد کے عالم میں دیکھا تھا اور پھر وہ مسکرا دی تھی۔ اس کے جو بھی ارادے تھے، اس نے خود کو میرے سامنے وا کرتے ہوئے مجھے اس دنیا کا خوش ترین شخص بنا دیا تھا۔ پھر میں اسی خوشی میں سرشار وہاں بیٹھا رہا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے اردگرد اور اس نوجوان خاتون کو دیکھتا رہا۔ اس کا سیاہ لہراتا ہوا جوڑا اس کی گردن کے عقبی حصے سے ٹکراتا ہوا رقص کر رہا تھا، اس کے برہنہ بازو دونوں اطراف لہرا رہے تھے اور اس کی لچکیلی کمر میں لہریں پڑ رہی تھی۔

اپنا آخری نغمہ ختم کر کے وہ آرکسٹرا کے پیچھے چلی گئی اور غائب ہو گئی۔ پھر روشنیاں جل اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں سوچوں اور خوشیوں میں گم ہو چکا تھا۔ پھر میں نے خودکلامی کی کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ کیا مجھے فوری طور پر یہاں سے اٹھ جانا چاہیے اور دروازے پر اس کا انتظار کرنا چاہیے؟ لیکن میں اپنی طرف سے وضاحت کیوں کر کر پاؤں گا؟ بلاشبہ، اس دوران میں نے ایک لفظ بھی اس سے نہ کہا تھا۔ اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں اس کا انتظار کروں اور اسے گھر تک

چھوڑوں؟ اگر میں نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو وہ کیا سوچے گی؟ اگر میں عورتوں کے رسیا کسی مرد کی طرح گھٹیا الفاظ استعمال کروں تو پھر وہ کیوں چاہے گی کہ مجھ میں دلچسپی ظاہر کرے؟

یوں میں نے فیصلہ کرلیا کہ زیادہ بہتر ہوگا کہ میں فوراً ہی یہاں سے چلا جاؤں اور اگلی شب پھر آؤں۔ اس طرح ہماری دوستی بتدریج پروان چڑھے گی...... ایک رات کے لیے اتنا ہی کافی تھا...... لڑکپن ہی سے میں اپنی خوشی ضائع کرنے سے خائف تھا، ہمیشہ سے ہی میری خواہش تھی کہ میں آئندہ کے لیے اپنی کچھ خوشی بچا کر رکھوں۔ اس کے باعث میں نے بہت سے مواقع ضائع بھی کیے۔ پھر بھی میں زیادہ خوشی کی خواہش سے ہمیشہ ہچکچاتا رہا مبادا کہ میری خوش قسمتی کو نظر لگ جائے۔

میں نے بیرے کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ جب میری نگاہیں آرکسٹرا پر پڑیں، میں نے اس کے قدموں کی چاپ واپس آتی سنی۔ اب کی بار اس کا وائلن اس کے ہاتھ میں نہ تھا اور اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ کی کہ یہاں اس کا کون منتظر تھا۔ لیکن وہ میری طرف...... میری ہی طرف بڑھ رہی تھی جبکہ وہی دوستانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر سجی ہوئی تھی۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، ''کیسے مزاج ہیں؟'' اس نے کہا۔

کسی نہ کسی طور اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''تمہارا شکریہ...... میں ٹھیک ہوں۔''

وہ میز پر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اپنے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

یہ کہنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ میں نے اپنے پراگندہ ذہن کو اضطراب کے عالم میں ٹٹولا۔ ''ناراض؟'' میں نے کہا، ''نہیں، بالکل نہیں۔''

اس کی آواز کس قدر مانوس تھی! اس لیے کہ میں اس کے چہرے کی ہر لکیر سے بہ خوبی شناسا تھا اور اسے پڑھ سکتا تھا۔

پینٹنگ کو بار بار دیکھنے کے باعث یہ شبیہ میرے ذہن میں نقش ہو چکی تھی۔ اصل پینٹنگ

دیکھ کر یہ نقش مزید گہرا ہو گیا تھا۔لیکن اس کی آواز...... جیسے میں نے یہ آواز پہلے بھی کہیں سنی ہو...... بہت پہلے شاید اپنے بچپن میں......شاید میں نے یہ آواز اپنے تصور ہی میں سنی ہو۔

میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور خود کو سمجھایا۔بہت ہو گیا! وہ یہاں موجود ہے، میری میز پر۔وہ مجھ سے مخاطب ہے۔یہ ایسا وقت نہیں کہ احمقانہ خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دی جائے۔

اس نے ایک دفعہ پھر مجھ سے پوچھا،''تم مجھ سے ناراض نہیں تو پھر تم واپس کیوں نہیں آئے؟''

اوہ خدایا! معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے کوئی اور شخص سمجھ رہی تھی...... میں نے یہ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ مجھے کیوں کر جانتی ہے لیکن رک گیا کیوں کہ اس قسم کا سوال مناسب نہ تھا۔اگر وہ غلط سمجھ بیٹھے؟ ہوسکتا ہے وہ معذرت کرے اور یہاں سے اٹھ کر چلی جائے۔

بہتر تھا کہ یہ خواب، یہ معجزہ جاری رہتا، جب تک کہ ممکن ہوسکتا۔اس خواب کو ختم کر کے مجھے کیا حاصل ہوگا؟ جلد ہی میں بیدار ہو جاؤں گا اور حقیقت مجھ پر کھل جائے گی۔

جب میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا، اس نے موضوع بدل دیا اور کہا،''کیا تمہاری والدہ تمہیں خط لکھتی ہیں؟''

میں کرسی سے یوں اچھل پڑا گویا مجھے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا،''اوہ میرے خدا، یہ تم تھیں؟'' اور پھر تمام صورتِ حال مجھ پر واضح ہوگئی۔بالآخر مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ میں نے کیسے اس کی آواز پہچانی تھی۔

وہ ہولے سے ہنس دی۔''تم واقعی عجیب نوجوان ہو۔''

میں نے وہ ہنسی بھی پہچان لی۔وہ اسی انداز میں ہنسی تھی جب وہ پینٹنگ کے سامنے میرے ساتھ چوبی لمبی نشست پر بیٹھی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اس تصویر کے متعلق میرا کیا خیال تھا اور جب میں نے کہا کہ اس تصویر میں موجود خاتون نے میری والدہ مجھے یاد دلا دی تو وہ اسی انداز میں ہنسی تھی اور مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میرے پاس میری والدہ کی کوئی تصویر تھی...... میں یہ بات سمجھ نہ سکا کہ میں کس طرح اس وقت اسے پہچاننے سے قاصر رہا۔کیا اس پینٹنگ نے مجھے سحر زدہ

کر دیا تھا؟ کیا اس تصویر نے مجھے حقیقی دنیا سے غافل کر دیا تھا؟

''لیکن تم اُس وقت اس تصویر جیسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔'' میں نے زیرلب کہا۔

''تمہیں یہ کیوں کر علم ہے؟'' اس نے کہا، ''تم نے تو میرا چہرہ دیکھا ہی نہیں تھا۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ دیکھا تھا...... یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''تم نے محض ایک یا دو دفعہ سرسری نظر ڈالی تھی......لیکن کیا تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ کیسے؟ جیسے تم مجھ سے ملاقات کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔''

اس نے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے: ''جب میں اپنے دوستوں کے پاس پہنچی، میں نے انہیں نہیں بتایا کہ تم نے مجھے پہچانا ہی نہیں، ورنہ وہ تم پر ہنستے۔''

''تمہارا شکریہ!''

وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں گم ہوئی اور اس کی آنکھوں پر بادل سا چھا گیا۔ وہ سنجیدہ ہوگئی۔ ''تو تمہاری اب بھی یہی خواہش ہے کہ تمہاری اس جیسی ماں ہو؟''

ایک لمحے کے لیے میں یاد کرنے سے قاصر رہا۔ پھر مجھے میرے ہی الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔ ''بلاشبہ...... قطعی...... عین اسی طرح......''

''بالکل اسی طرح؟''

''شاید......''

ایک دفعہ پھر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ ''لیکن میں کیوں کر تمہاری ماں ہوسکتی تھی؟''

''اوہ، نہیں، نہیں......''

''ممکن ہے کہ تمہاری بہن......!''

''تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''تم اس طرح کے سوالات کیسے پوچھ سکتے ہو؟ میری عمر چھبیس برس ہے......اور تمہاری......؟''

''چوبیس۔''

''دیکھ لو، میں تمہاری بہن ہو سکتی ہوں۔''

''ہاں......''

ہم ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ میرے پاس اس سے کہنے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ برسوں، حتیٰ کہ ازل سے آج تک کا خلا پُر ہو جاتا......لیکن اس وقت...... میں ایک لفظ بھی نہ سوچ پایا۔ وہ بھی خالی نظروں سے کہیں دور خلا میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی دائیں کہنی میز پر ٹکی تھی اور اس کا ہاتھ بے خبری میں سفید میز پوش پر دھرا تھا۔ اس کی لمبی، نفیس، خوبصورت انگلیوں کی پوریں سرخ ہو گئی تھیں کہ جیسے سردی سے۔ اور اب، مجھے یاد آیا کہ اس کے ہاتھ کس قدر یخ معلوم ہوتے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کہا: ''تمہارے ہاتھ بہت سرد ہیں۔''

اس نے ہچکچائے بغیر جواب دیا، ''انہیں گرم کر دو۔'' اور اس نے اپنے ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی نگاہوں سے بے باکی اور شوخی جھلک رہی تھی۔ اس وقت تقریباً یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی ایسے شخص کی ہاتھ میں اپنے ہاتھ دینے پر اسے کوئی غیر معمولی پن نظر نہ آیا تھا جس سے وہ پہلی بار مخاطب ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ؟ ایک دفعہ پھر میرا ذہن پراگندہ ہو گیا اور مہمل امکانات پر غور کرنے لگا۔ اس لیے میں نے اس امید پر اسے مخاطب کیا کہ شاید میرے خدشات رفع ہو جائیں: ''مجھے امید ہے کہ نمائش میں تمہیں نہ پہچاننے پر تم مجھے معاف کر دو گی۔'' میں نے کہا، ''اس کا سبب یہی تھا کہ تم بہت زندہ دل تھی......تم نے مجھے دق بھی کیا...... اور پھر میں یہ کس طرح کہہ سکتا تھا، تم اس پینٹنگ جیسی نہیں تھیں......تمہارے بال چھوٹے تھے......تم نے مختصر سی سکرٹ پہن رکھی تھی اور تمہارا کوٹ بھی بہت تنگ تھا...... جب تم تیزی سے پرے جا رہی تھیں......اور پھر تمہیں اس سنجیدہ، پُرخیال بلکہ دکھی تصویر میں دیکھنا مشکل تھا جسے ناقدین میڈونا کہتے تھے......اس کے باوجود، مجھے شدید حیرت ہے...... میں شاید خیالوں میں گم ہو گیا تھا۔''

''ہاں، یونہی ہوا تھا...... مجھے یاد ہے جب تم پہلے روز نمائش دیکھنے آئے تھے۔ تم گیلری میں قدرے بیزاری کے عالم میں تصویروں پر نظر ڈال رہے تھے اور پھر تم اچانک میری تصویر کے

سامنے رک گئے۔تم نے اسے بہت ہی عجیب انداز میں دیکھا تھا!اور تمہارے اردگرد موجود ہر شخص نے یہ بات محسوس کی۔ایک لمحہ کے لیے مجھے خیال آیا کہ تمہیں یہ تصویر کسی شناسا کی محسوس ہوئی ہے۔پھر تم نے ہر روز آنا شروع کر دیا......اس لیے فطری طور پر میں تمہارے متعلق تجسس میں مبتلا ہوگئی۔اب اکثر میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جاتی۔ہم اکٹھے بیٹھتے،اکٹھے تصویریں دیکھتے لیکن پھر بھی تم نے مجھے پہچانا نہیں،یہ بھی کہ تم بعض اوقات اس اجنبی پر نظر ڈال لیتے جو تمہارا ارتکاز برباد کر رہی تھی۔جس طرح تم وہاں سوچ میں گم بیٹھے ہوتے تھے،وہ قدرے پُرکشش انداز تھا......جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میں تمہارے متعلق بہت تجسس میں مبتلا ہوگئی تھی......پھر ایک روز میں تمہارے پاس آئی اور تم سے مخاطب ہوئی۔میرے فنکار دوست بھی میری طرح تمہارے متعلق بہت متجسس تھے......یہ ان کا خیال تھا......لیکن میری خواہش تھی کہ ایسا نہ ہوتا......کیوں کہ اس کے بعد میں نے تمہیں بالکل ہی کھو دیا......تم یہاں سے تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔''

''میں نے یہی سمجھا تھا کہ تم میرا مضحکہ اڑا رہی ہو۔''میں نے اس خدشے کی خاطر فوری طور پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔لیکن اس نے کہا،''تم درست سمجھے تھے۔''

اس نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی اور کہا،''تم برلن میں تنہا ہو، ہے ناں؟''

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''میرا مطلب ہے،تنہا......اکیلا......کوئی ساتھ نہیں......روحانی طور پر تنہا......میں تمہیں کیسے بتاؤں......تمہارے متعلق یہ مشہور ہے کہ......''

''میں سمجھتا ہوں......میں قطعی تنہا ہوں......لیکن محض برلن میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں اکیلا ہوں......میں تو بچپن سے ہی اکیلا ہوں......''

''میں بھی......''اس نے کہا۔اس دفعہ اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔''میں اس قدر تنہا ہوں کہ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں سانس بھی نہیں لے سکتی......میں اس دنیا میں ایسی یک و

تنہا ہوں کہ جیسے کوئی بیمار کتا تنہا ہو۔''

میرے ہاتھ پہلے سے کہیں مضبوطی سے تھامتے ہوئے، اس نے انہیں اوپر اٹھا دیا۔ پھر اس نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا، ''ہم دوست ہو سکتے تھے۔'' وہ چلائی، ''تم تو ابھی مجھے جاننے کی کوشش کر رہے ہو......لیکن میں تقریباً بیس دن سے تمہیں دیکھ رہی ہوں......تم میں کوئی خاص بات ضرور ہے...... ہاں، ہم بہت ہی اچھے دوست ثابت ہو سکیں گے۔''

سراسیمگی کے عالم میں، میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہی تھی؟ میرے جیسی صورتِ حال کے شکار شخص کو وہ کیا پیش کر سکتی تھی؟ مجھے قطعی معلوم نہ تھا۔ مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی مجھے لوگوں کے متعلق کچھ علم تھا۔

وہ یہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ مجھے بھی اس کے خدشات نظر آ رہے تھے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ وہ بہت دور تک بڑھ گئی تھی یا اس نے جو کچھ کہا، اس کا میں کہیں غلط مطلب نہ لے لوں، وہ کہنے لگی: ''اب عام لوگوں کی طرح مت سوچنا شروع کر دینا......جو کچھ میں کہوں، اس میں تفصیل تلاش کرنے مت شروع ہو جانا......تمہیں محض یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں ہمیشہ......اسی طرح......ایک مرد کی طرح......کھلی کتاب کی مانند ہوں......میں کئی دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی مرد جیسی ہوں......شاید یہی وجہ ہے کہ میں تنہا ہوں......''

اس نے یہ کہنے سے قبل مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی: ''اور تم کچھ کچھ کسی عورت جیسے دکھائی دیتے ہو! اب میں یہ دیکھ سکتی ہوں۔ ممکن ہے کہ یہی وجہ ہو کہ میں تمہیں دیکھتے ہی پسند کرنے لگی تھی......ہاں، بلاشبہ، یہی بات ہے۔ تم میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس پر مجھے کسی نوجوان لڑکی کا خیال آتا ہے......''

اس وقت میں کس قدر حیران......اور کس قدر صدمے سے دوچار ہوا......جب میں نے اپنے والدین کے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت سنی!

''میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی جس طرح تم نے مجھے کل رات دیکھا۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی، ''جب بھی میں اس بارے سوچتی ہوں، میری ہنسی نکل جاتی ہے۔ تم تو کسی نوجوان لڑکی کی طرح شرما اور چھوئی موئی ہوئے جا رہے تھے جو اپنی عزت کی حفاظت کرنے کی تگ و دو

میں ہو۔لیکن فاؤ وین ٹیڈ مین کے پنجوں سے بچ نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔''

حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ مجھے اس کے متعلق علم نہ ہو؟ ہم رشتہ دار ہیں۔وہ میری کزن ہے۔لیکن ہمارے تعلقات اچھے نہیں...... دراصل، ان حالات کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ میری ماں نے اس کے تعلقات قطع کیے اور اس کا سبب اس کا رویہ تھا۔اس کا شوہر ایک وکیل تھا۔وہ جنگ میں مارا گیا۔اب وہ ایک ایسی زندگی بسر کررہی ہے جو میری ماں کے نزدیک ''نامناسب'' ہے......لیکن یہ ہمارا معاملہ نہیں۔کل رات کیا ہوا، کیا تم بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے؟ تم ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہو؟''

''ہم ایک ہی ہوٹل پنشن میں رہتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔وہ پنشن میں مقیم ایک اور شخص کے بہت قریب ہے......ڈوپکے صاحب۔ہم نے اسے راہداری میں آتے دیکھ لیا تھا۔''

''ممکن ہے کہ ان کی بھی شادی ہوجائے۔''

اس نے جس طرح یہ الفاظ ادا کیے، اس سے بہ خوبی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔ایک لمحے کے لیے ہم دونوں خاموش ہو گئے لیکن ہم ابھی تک ایک دوسرے پر واضح کیے بغیر ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔جب بھی ہماری آنکھیں چار ہوتیں، ہم مسکرا دیتے۔

پھر میں نے ہی خاموشی توڑی:''تو پھر تمہاری ایک ماں ہے؟''

''ہاں، جس طرح تمہاری ہے!''

اس قسم کا احمقانہ سوال پوچھنے پر میرا خود کو ایک ٹھوکر رسید کرنے کو جی چاہا۔یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس نے موضوع تبدیل کر دیا تھا، میں نے کہا،''میں نے تمہیں پہلی بار یہاں دیکھا ہے۔''

''ہاں......میں بھی پہلے کبھی اس قسم کی جگہ نہیں آئی......لیکن آج رات......''

''آج رات؟''

اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے میں نے کہا، ''میں نے یہاں تک تمہارا پیچھا کیا تھا۔''

مجھے محسوس ہوا کہ میری بات سن کر وہ حیران ہوئی تھی۔ ''کیا تم ہی تھے جو دروازے تک میرا پیچھا کر رہے تھے؟''

''ہاں، تو تمہیں معلوم تھا؟''

''بلاشبہ، یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت ایسی بات محسوس نہ کرے؟''

''لیکن تم نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔''

''میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی۔''

ایک بار پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کسی معاملے پر غور کر رہی تھی۔ پھر ایک شرارت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگی، ''یہ تو محض ایک کھیل ہے جو میں کھیلتی ہوں، اگر میرا خیال ہو کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے، تو میں اپنے تجسس کو خود پر غالب نہیں آنے دیتی۔ میں کبھی مڑ کر نہیں دیکھتی بلکہ میں تمام امکانات پیش نظر رکھتی ہوں۔ کیا میرا پیچھا کرنے والا نوجوان ہے یا پھر کوئی کمزور ضعیف شخص جو جوان عورتوں کو پسند کرتا ہے؟ یا پھر کیا وہ کوئی دولت مند شہزادہ ہے؟ یا پھر کوئی قلاش طالب علم؟ یا پھر نشے میں دھت ایسا شخص جس کا کوئی گھر بار نہیں؟ میں ان کے قدموں کی چاپ سے ان کے متعلق اندازہ لگانے کی کوشش کرتی ہوں اور مجھے معلوم ہو جاتا ہے!......تو آج رات تم میرا تعاقب کر رہے تھے؟ لیکن تمہارے قدموں میں ہچکچاہٹ تھی جس سے میں نے تمہیں کوئی بوڑھا اور شادی شدہ مرد سمجھا۔''

اب وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی: ''تو پھر تم نے سڑک پر میرا انتظار کیا؟''

''ہاں!''

''تمہیں کس طرح علم ہوا کہ میں وہاں سے گزروں گی؟ کیا تمہیں علم ہے کہ میں یہاں کام کرتی ہوں؟''

''نہیں، یہ مجھے کیوں کر معلوم ہوسکتا تھا؟ میرا خیال تھا کہ شاید...... بلاشبہ، مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا لیکن میں نے خود کو عین اسی وقت عین اسی جگہ پایا تھا، اس لیے میں دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔''

''آؤ، چلتے ہیں......راستے میں باتیں کرتے جائیں گے......''

میری حیرت بھانپتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا،''کیا تم میرے ساتھ گھر نہیں جانا چاہتے؟''

میں اپنی نشست سے گرہی پڑااور مجھے اس حالت میں دیکھ کراسی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''میرے دوست، کوئی جلدی نہیں۔'' اس نے کہا،''میں اپنا لباس تبدیل کرلوں۔ دروازے پر میرا انتظار کرو، میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔''

اپنے قدموں پر اٹھتے ہوئے اس نے اپنا لبادہ اٹھایا اور چلی گئی۔آرکسٹرا کے عقب میں غائب ہونے سے پہلے، وہ واپس مڑی اور اپنی حسین اور سحر انگیز آنکھیں مجھ پر جمائیں۔اس نے یوں آنکھ ماری جیسے ہم چالیس برس پرانے دوست ہوں۔

میں نے بیرے کو طلب کیااور بِل کا پوچھا۔اس وقت یکلخت میرا دل بہت ہلکا پھلکا بلکہ بہادر ہو گیا۔ بیرا کو کھڑے اپنی انگلیوں مروڑتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیلنے لگی اور میں نے کہا،''بے وقوفو، دیکھو میں کس قدر خوش ہوں!' میں کمرے میں موجود ہر گاہک کو سلام پیش کرنا اور چاہتا تھا کہ میں انہیں اپنی بانہوں میں بھرلوں، حتیٰ کہ موسیقاروں کو بھی پرانے دوستوں کی طرح گلے لگالوں۔

اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے میں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں میرا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔اگرچہ میں عام طور پر اس قسم کے طرزِعمل کو ناپسند کرتا تھا، میں نے اس خاتون کا شکریہ ادا کیا جس نے میرا کوٹ میرے حوالے کیا۔باہر نکل کر میں نے گہرا سانس لیا اور اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ انہوں نے روشنیاں بجھا دی تھیں۔دروازے کے اوپر لگا برقی بورڈ اب روشن نہیں تھا اور اب لفظ 'اٹلانٹک' بھی جگمگا نہیں رہا تھا۔آسمان صاف تھا اور مغربی افق پر نقرئی ہلال چمک رہا تھا۔

اسی اثنا میں، میں نے اپنے عقب سے ایک مدھم سی آواز سنی:''کیا تمہیں انتظار میں کافی دیر ہوگئی؟''

''نہیں، میں ابھی باہر آیا ہوں۔''میں نے مڑتے ہوئے کہا۔

وہ میرے بالکل سامنے کھڑی تھی اور اس کا چہرہ اس شخص کی طرح سرخ ہو رہا تھا جو کسی

فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالآخر اس نے کہا، ''تم مجھے ایک اچھے شخص معلوم ہوتے ہو۔''

لیکن اس وقت تک میری ہمت میرا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اگرچہ میری خواہش تھی کہ میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا ہاتھ میں تھام لوں اور اس کا بوسہ لوں لیکن میں محض اس کے کان میں مدھم لب ولہجہ میں سرگوشی ہی کر سکا۔ ''واقعی؟ مجھے معلوم نہیں۔''

اس نے میرا ہاتھ اس طور تھام لیا کہ جیسے مجھے اطمینان دلا رہی ہو۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے میری ٹھوڑی تھامتے ہوئے وہ مجھ سے ایسے لب ولہجہ میں کہنے لگی جیسے بچے کو تسلی وتشفی دی رہی ہو: ''اوہ، تم تو واقعی معصوم ہو، کیا ایسا نہیں؟ کسی لڑکی کی طرح پاکباز۔''

سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔ مجھے خاتون کا اس طرح بے تکلفی سے پکارنا اچھا نہ لگا تھا۔ شکر کہ وہ مزید آگے نہ بڑھی۔ میری ٹھوڑی اور بازو چھوڑتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ بھی اپنے پہلوؤں میں گرا لیے۔ جب بالآخر میں نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں تو مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے اسے کوئی صدمہ پہنچا ہو بلکہ شرمندہ ہو۔ اس کے رخساروں کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور اس کی گردن بھی سرخی مائل ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں کہ جیسے وہ مجھے بمشکل دیکھنا چاہ رہی ہو۔ یکا یک میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا: ''وہ یوں کیوں کر رہی ہے؟ واضح طور پر وہ اس قسم کی خاتون نہیں ...... لیکن پھر...... وہ اس قسم کا طرزِ عمل کیوں اختیار رہی ہے؟''

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نے میرا ذہن پڑھ لیا ہو۔ ''میں تو بس اسی قسم کی عورت ہوں۔'' اس نے کہا، ''میں ایک انوکھی اور عجیب عورت ہو...... اور اگر تم چاہتے ہو کہ میرے دوست بنو تو تمہیں بہت سی چیزوں کا عادی ہونا پڑے گا۔ میری چھوٹی چھوٹی متلون مزاجیاں، میرے بے ڈھنگے اوقات کار...... میں تمہیں خبردار کرنا چاہتی ہوں...... میرے دوستوں نے ہمیشہ مجھے مضطرب اور مشتعل قسم کی مخلوق پایا ہے......''

تب، اپنے متعلق یوں سخت موقف اختیار کرنے پر کہ جیسے وہ کچھ غصہ محسوس کر رہی ہو، اس نے ایک ایسا لب ولہجہ اختیار کر لیا جو تلخی کی حد تک بے باک تھا۔ ''سمجھ لو، مجھے دوستوں کی ضرورت نہیں اور میں دوستوں کو تلاش بھی نہیں کرتی...... میں دوسروں کی مہربانیوں پر انحصار کرنے

کی قائل نہیں...... میں ممنونِ احسان ہونے والی نہیں...... اس لیے اب سب کچھ تم پر منحصر ہے......''

میرے لب ولہجہ میں حسب معمول خوف کا عنصر موجود تھا۔ ''میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔'' ہمارے درمیان کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے اپنا بازو میرے گرد حمائل کر دیا اور باتیں کرنے لگی۔ اس کا لب ولہجہ یوں سپاٹ تھا کہ جیسے ہم کسی معمولی معاملے کے متعلق بات کر رہے ہوں۔

''تو پھر تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گے؟ یہ کوئی برا خیال نہیں...... لیکن میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں۔۔ تمہاری یہ کوشش بے سود ہو سکتی ہے۔ کسی زمانے میں، میں یہ سوچتی تھی کہ میں واقعتاً ایک اچھا دوست بنا سکتی ہوں۔ وقت بتائے گا۔ اگر میں گاہے گاہے تمہیں معمولی دلائل اور معمولی باتوں میں پھنسالوں، تو پھر زیادہ توجہ نہ دینا اور اسے اپنی ذات پر مت لینا۔''

سڑک کے درمیان میں رکتے ہوئے، اس نے اپنی انگلی میری طرف لہرائی کہ جیسے کسی بچے کو کہہ رہی ہو کہ بہادر بنو: ''تمہیں یہ ایک بات ہر قیمت پر یاد رکھنی چاہیے۔ یہ سب کچھ اسی لمحہ ختم ہو جائے گا جب تم نے مجھ سے کوئی امید وابستہ کر لی۔ تم مجھ سے کسی چیز کا تقاضا نہیں کر سکتے...... کوئی بھی چیز...... کیا تم سن رہے ہو؟'' یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی بے چہرہ دشمن کے ساتھ بحث کر رہی ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کا لب ولہجہ اشتعال کے عالم میں بھاری ہو گیا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ میں تم سے کیوں نفرت کرتی ہوں؟ تم اور دنیا کے ہر دوسرے مرد سے مجھے کیوں نفرت ہے؟ کیوں کہ تم ہمارے بارے میں سوالات بہت پوچھتے ہو کہ جیسے یہ تمہارا فطری حق ہو...... میری بات یاد رکھو کیوں کہ کوئی ایک لفظ بولے بغیر بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے...... کس طرح مرد ہمیں دیکھتے اور ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہیں، ہمیں دیکھ کر اپنے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہم سے کیسا رویہ اور طرزِ عمل اپناتے ہیں...... تم اندھے ہو اگر تم یہ نہ دیکھ سکو کہ وہ کس قدر پُراعتماد ہوتے ہیں اور کس قدر احمقانہ طور پر اسے حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ ان کے غرور کا اندازہ کر سکو تو پھر تمہیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ انہیں اس وقت کس قدر صدمہ پہنچتا ہے جب ان کی طرف سے کسی بھی پیشکش کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ وہ شکاری ہیں اور ہم ان کے بدنصیب شکار ہیں۔ اور ہمارے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں؟ کہ ان کے سامنے

سر تسلیم خم کر دیں، ان کی ہر خواہش پوری کریں......لیکن ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، ہمیں اپنی ذات کا خفیف سا حصہ بھی نہیں دینا چاہیے۔ مردانہ تکبر کے خلاف یہ بغاوت ہے......کیا تم سمجھ رہے ہو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں؟ ہاں، بہت خوب، یہی وجہ ہے کہ میرا خیال ہے کہ ہم دوست ہو سکتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے تم میں اس مردانہ غرور کی خفیف سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی......لیکن مجھے معلوم نہیں......منہ میں بھیڑ بھی ہو، تب بھی کوئی بھیڑیا اپنے وحشی پن کو ایک مسکراہٹ کے پیچھے چھپا سکتا ہے......''

اس کی تقریر کے درمیان ہم نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا تھا۔ تیزی سے چلتے ہوئے جبکہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے اشتعال کا اظہار کر رہی تھی، وہ اب کبھی آسمان اور کبھی زمین پر اپنی نظریں جما لیتی۔ وہ فقرہ بولتے ہوئے رک جاتی کہ جیسے سب کچھ کہہ چکی ہو۔ پھر اپنی آنکھیں بھینچتی ہوئی وہ دوبارہ چلنا شروع کر دیتی۔

کچھ دیر ہم یونہی چلتے رہے۔ ایک بار پھر ہمارے درمیان طویل خاموشی چھا گئی۔ میں خوفناک خاموشی کے عالم میں اس کے ساتھ چل رہا تھا کہ وہ ٹائیر گارٹن کے نزدیک ایک سڑک پر واقع تین منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔

''میں یہاں......اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہوں۔'' اس نے کہا، ''ہم یہ بات کل جاری رکھ سکتے ہیں......لیکن کلب مت آنا......میرا نہیں خیال کہ تمہیں دوبارہ وہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی...... یہ میں تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہی ہوں......ہم کل کسی بھی وقت ملیں گے......ہم اکٹھے چہل قدمی کر سکتے ہیں۔ میں تمہیں برلن میں اپنے کچھ پسندیدہ مقامات دکھا سکتی ہوں، پھر دیکھیں گے کہ تمہارا ان کے متعلق کیا خیال ہے۔ اس لیے اب شب بخیر......ایک منٹ...... مجھے ابھی تک تمہارا نام نہیں معلوم!''

''راعف۔''

''صرف راعف؟''

''خطیب زادے راعف۔''

''اوہ، یہ مشکل ہے......میں اسے کس طرح یاد رکھ سکوں گی؟ میں اس کا تلفظ نہیں

کر سکتی۔ کیا میں محض راعف کہہ سکتی ہوں؟''

''مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''اور تم مجھے ماریا کہہ سکتے ہو...... کہ جس طرح میں نے کہا کہ کسی کی ممنونِ احسان نہیں ہو سکتی۔''

وہ دوبارہ مسکرائی اور اگرچہ ہماری اس ملاقات کے دوران کئی بار اس کے تاثرات تبدیل ہوئے، اب اس کے چہرے پر میرے لیے دوستانہ تاثرات تھے۔ وہ آگے بڑھی اور میرا ہاتھ سختی سے تھام لیا۔ پھر ایک شفیق اور قدرے معذرت خواہانہ لب و لہجے میں اس نے مجھے شب بخیر کہا، مڑی اور چابیاں نکالیں۔ میں آہستہ آہستہ چلنے لگا لیکن میں نے محض دس قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی جو مجھے پکار رہی تھی۔

''راعف!''

میں مڑا اور انتظار کرنے لگا۔

''واپس آؤ! واپس آ جاؤ!'' مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ خود کو ہنسنے سے باز رکھنے کی کوشش میں ہو۔ اور پھر، انتہائی خوش اخلاقی سے وہ کہنے لگی: ''میں خوش ہوں کہ ہم دونوں نے اپنے اپنے نام پر اتفاق کر لیا ہے۔'' وہ سیڑھیوں کے اوپر کھڑی مجھ سے بات کر رہی تھی، اس لیے میں نے اسے دیکھنے کی خاطر اپنی نظریں اٹھائیں۔ لیکن وہاں بہت اندھیرا تھا، اس لیے کوئی بھی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں منتظر رہا کہ وہ چلی جائے۔ اس پر ابھی تک ہنسی طاری تھی لیکن وہ خود کو سنجیدہ کرنے کی بہت کوشش کر رہی تھی۔ ''تو پھر تم جا رہے ہو؟''

میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ کیا میں یہاں ٹھہرنے میں خوشی محسوس کرتا؟ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ لیکن جس قدر زیادہ میرا ذہن اسے مسترد کر رہا تھا، امید مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ''کیا مجھے ٹھہرنا چاہیے؟''

وہ دو قدم نیچے آ گئی۔ اب اس کا چہرہ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں اب متجسس اور ہوشیار نظر آ رہی تھیں۔ ''تو تمہیں ابھی تک معلوم نہیں کہ میں نے تمہیں واپس کیوں بلایا؟''

اوہ ہاں...... مجھے معلوم تھا...... میں اس کی بانہوں میں سمانے واپس آیا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے نقصان، صدمے، حتیٰ کہ اکائی کا احساس ہوا۔شرم کے مارے میں نظر جھکا کر زمین کو دیکھنے لگا۔نہیں،نہیں! میں اس قسم کا شخص نہیں بننا چاہتا۔

وہ اپنے ہاتھ سے میرا رخسار سہلا رہی تھی۔''تمہارے ساتھ کیا بیت رہی ہے؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تم ابھی رونے لگو گے۔تمہیں تو محض بہن کی نہیں بلکہ واقعی ماں کی ضرورت ہے......اس لیے، بتاؤ، کیا تم واقعی جا رہے تھے؟''

''ہاں۔''

''تم مجھے تلاش کرنے کے لیے دوبارہ اٹلانٹک نہیں جاؤ گے......ہم نے پر اتفاق کیا ہے۔''

''ہاں، ہم کل دن میں کسی بھی وقت مل سکتے ہیں۔''

''کہاں؟''

میں اسے احمقانہ انداز میں دیکھنے لگا۔میں نے تو اس کے متعلق سوچا بھی نہیں۔دکھ بھری مدھم آواز میں، میں نے استفسار کیا:''کیا تم نے اسی لیے مجھے واپس بلایا ہے؟''

''بلاشبہ......تم واقعی دوسرے مردوں سے مختلف ہو......پہلی چیز وہ یہ کرتے ہیں کہ سب سنبھال لیتے ہیں۔تم نے منہ اٹھایا اور چل دیئے......جس قسم کے شخص کی تم تلاش میں ہو، ضروری نہیں کہ تمہیں ہر جگہ مل جائے، جس طرح آج رات ہوا۔''

اب ایک خوفناک شک نے مجھے گھیر لیا۔میں حیران تھا کہ اگر یہ تمام کوئی معمولی معاشقہ ہی ہو۔میں اس سے کبھی اتفاق کر ہی نہیں سکتا تھا۔میں فرکوٹ والی میڈونا کو یوں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا بلکہ بہتر یہی ہوتا کہ مجھے احمق اور نابالغ سمجھ کر ٹھکرا دیا جائے۔اس کے باوجود اس خیال نے مجھے افسردہ کر دیا...... میں نے تصور میں دیکھا کہ میرے جانے کے بعد وہ میرا مذاق اڑا رہی تھی، میری معصومیت اور مجھ میں حوصلے کی کمی پر ہنسی اڑا رہی تھی۔میں نے تصور میں دیکھا کہ ہر ایک سے میرا اعتماد اٹھتا جا رہا تھا اور میں ساری دنیا سے خود کو الگ تھلگ کر رہا تھا۔

لیکن اب میرا ذہن مطمئن تھا۔میں کتنا شرمندہ تھا کہ میں نے ایسے بے بنیاد اندیشے

پالے! میں اس دوست کا کس قدر شکر گزار تھا جس نے یہ تمام خدشے ختم کر دیئے تھے! ایسی ہمت جمع کرتے ہوئے جو مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ میں تھی، میں نے کہا، ''تم ایک غیر معمولی عورت ہو۔''

''اس قدر جلدی نتائج مت اخذ کیا کرو...... مجھ جیسے کسی کی موجودگی میں تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔''

میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ان کا بوسہ لیا۔ غالباً میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ایک لمحے کو وہ میرے بہت ہی نزدیک آ گئی تھی کہ جیسے ہم آغوش ہونے کو ہو۔ اس کی آنکھوں میں گرم جوشی کی چمک دیکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ میرے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ جنت محض چند سنٹی میٹر دور تھی لیکن تب، اس نے یکلخت سختی سے اپنے ہاتھ چھڑائے، کھڑی ہوئی اور کہنے لگی، ''تم کہاں رہتے ہو؟''

''لوٹز وسٹریٹ۔''

''تو تم یہاں سے زیادہ دور نہیں رہتے...... کل بعد دوپہر تم یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔''

''تم کس اپارٹمنٹ میں رہتی ہو؟''

''میں کھڑکی میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہیں اوپر آنے کی ضرورت نہیں۔''

دروازے میں چابی گھماتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئی۔

اس مرتبہ میں نے وہاں سے جانے میں بہت جلدی کی۔ میرا بدن ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ جیسے اس کا تصور میری رہنمائی کر رہا ہو۔ اب میں خود سے زیر لب کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ کافی غور کرنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اس کا نام دہرائے جا رہا ہوں اور شیریں اور میٹھے الفاظ میں اپنے لگاؤ کا اظہار کر رہا ہوں۔ کبھی کبھار میری ہنسی بھی نکل جاتی۔ تاہم، جب میں پنشن پہنچا، سویرا ہو چکا تھا۔

بچپن سے اب تک پہلی بار میں نے سونے سے پہلے گزشتہ دن کی بے معنی نوعیت اور بے مقصدیت پر غور نہ کیا، جو محض اس سے پہلے دن کی مانند تھا اور میں جس میں بھٹکتا ہی رہا تھا۔

اگلے روز میں فیکٹری نہ گیا۔ بعد دوپہر تقریباً اڑھائی بجے میں ماریا پوڈر کے اپارٹمنٹ

تک جانے کے لیے ٹیئر گارٹن کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ میں شاید جلدی نکل کھڑا ہوا
تھا۔ میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ رات گئے تک کام کرنے کے بعد
وہ کس قدر تھک چکی ہوگی۔ اس کے لیے میری ہمدردی کا کوئی شمار نہیں تھا۔ میں نے اسے تصور میں
بستر میں لیٹے دیکھا، اس کے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے، اس کا سانس آہستہ تھا۔ مجھے یہ بھی
محسوس ہوا کہ اس سے بڑھ کر خوشی کا کوئی تصور نہ تھا۔

زندگی بھر میں نے اپنے دل کا در بند ہی رکھا تھا۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہوا تھا کہ محبت کس
چڑیا کا نام ہے۔ لیکن اب یکلخت، محبت کے دروازے کھل گئے تھے۔ میرے خوابیدہ جذبات
بیدار ہو چکے تھے، اس شان دار عورت کو روشن کرنے کو۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ میرے اندازے،
میرے اپنے خیالات اور تصورات پر مشتمل تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے مکمل طور پر یقین تھا کہ
یہ خیالات و تصورات مجھے دھوکا نہیں دیں گے۔

عمر بھر میں اس کا منتظر رہا تھا۔ میری زندگی اس کی تلاش ہی میں گزر گئی، زندگی بھر میں
اپنے اردگرد اس کا نام و نشان ہی تلاش کرتا رہا۔ تلخ تجربے نے مجھے دوسری طرح دیکھنا سکھا دیا
اور کیا یہ کبھی غلط ثابت ہوا؟ اکثر اوقات دلیل اور تجربہ میرے قیاس پر حاوی ہو جاتے کیوں کہ
میرے ابتدائی تاثرات زیادہ تر درست ثابت ہوتے تھے۔ میں خود کو بتاتا تھا کہ میں فیصلہ کرنے
میں بہت جلدی کرتا ہوں۔ میں امکانات کو بھی پیش نظر رکھتا تا کہ جلد یا بدیر یہ معلوم کر سکوں کہ میں
تو درست تھا جبکہ بیرونی عناصر نے مجھے غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

اب ماریا پوڈر ایک ایسی خاتون تھی جس کے ساتھ میں کسی بھی قسم کی کوئی شرائط یا
تقاضے منسوب نہیں کر سکتا تھا، اگر مجھے زندہ رہنا تھا۔ شروع میں اس بات کو قبول کرنا مجھے کچھ عجب سا
معلوم ہوا۔ میں اس شخص کو کیسے چاہ سکتا تھا جس کے وجود سے محض کچھ لمحے پہلے ہی میں آگاہ ہوا تھا؟
لیکن کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا تھا؟ ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ چیزیں ہمیں چاہئیں، یہاں تک کہ وہ
ہمیں مل جائیں۔ اور اب، جب میں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، یہ مجھے محض اس لیے خالی
اور بے کار محسوس ہوتی ہے کیوں کہ وہ اس زندگی میں شامل نہ تھی۔ عمر بھر میں لوگوں کی صحبت سے

کتراتا رہا اور کسی بھی ہم جنس سے اپنے خیالات و احساسات کا اظہار نہیں کیا۔ اب یہ سب کچھ کس قدر بے معنی اور مہمل محسوس ہوتا ہے! میں سوچا کرتا تھا کہ بذاتِ خود زندگی ہے جس نے مجھے نیچا دیکھا دیا...... میری افسردگی اور رنجیدگی میری روحانی بے چینی کا نتیجہ تھی۔ ایک کتاب کے ساتھ دو گھنٹے گزارنے اور اسے دو برس کی حقیقی زندگی سے کہیں زیادہ باعث مسرت محسوس کرنے کے بعد مجھے دوبارہ یاد آتا کہ زندگی بے معنی ہے اور پھر میں دوبارہ مایوسی میں ڈوب جاتا۔

لیکن اس پینٹنگ پر پہلی دفعہ نظر ڈالنے کے بعد ہر چیز تبدیل ہوگئی تھی۔ میں گزشتہ دو ہفتوں میں اپنی تمام زندگی سے کہیں زیادہ جیا تھا۔ ہر دن، ہر گھنٹہ زندگی سے بھرپور تھا، خواہ میں سویا بھی ہوتا۔ محض میرے تھکے ماندے ہاتھ پیر زندگی کی طرف واپس نہیں آرہے تھے بلکہ میری روح بھی وہ اعلیٰ اور ارفع منظر آشکار کر رہی تھی جسے وہ عرصہ دراز سے نہاں رکھے ہوئے تھی۔ ماریا پوڈر نے مجھے بتایا تھا کہ مجھ میں بھی روح ہے۔ اور اب، زندگی بھر کی عادت پر قابو پاتے ہوئے، میں اس کے اندر کی روح دیکھنے پر قادر ہوگیا تھا۔ بلاشبہ، اس دنیا میں ہر شخص کو اسی طرح نوازا جاتا ہے۔ لیکن اس دنیا میں زیادہ تر افراد یہ جانے بغیر آتے اور چلے جاتے ہیں کہ انہیں کس چیز کی کمی ہے۔ ایک روح اس وقت ہی سامنے آتی ہے جب اسے اپنا جوڑ نظر آتا ہے، جب اسے خود کو سمجھانے کے لیے محض الفاظ پر انحصار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی...... اور یہ صورت حال اس وقت ہی پیدا ہوتی ہے جب ہم واقعی جینا شروع کرتے ہیں...... اپنی روح کے ساتھ جیتے ہیں۔ اس لمحے جب دو روحیں ہم آغوش ہوں، تمام شکوک اور شرم ایک طرف رکھے جا سکتے ہیں، تمام اصول توڑے جا سکتے ہیں۔ میری تمام رکاوٹیں گر چکی تھیں۔ اب میں محض یہی چاہتا تھا کہ اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں، اچھائیوں کو برائیوں کے ساتھ رکھ دوں، کمزوریوں کو خوبیوں کے ساتھ رکھ دوں، کوئی بھی چیز نہ چھپاؤں اور اپنی روح کو سامنے لے آؤں۔ مجھے اس سے بہت کچھ کہنا تھا...... اتنا کچھ کہنا تھا کہ تمام عمر بیت جائے۔ اس سے پہلے میں عمر بھر خاموش ہی رہا تھا۔ جب بھی مجھے بولنے پر مجبور کیا جاتا، میں فوراً ہی اپنا ارادہ تبدیل کر لیتا۔ ''کوئی فکر نہیں، تشویش کی کوئی بات نہیں۔'' میں خود کلامی کرتا، ''اگر تم بولے تو کون سا فرق پڑے گا؟'' ماضی میں، میں خفیف سے اشارے سے بھی یہ تصور کر لیتا کہ کوئی شخص مجھے سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن اس

دفعہ، میرے پہلے تاثرات ہی اس قدر بھرپور تھے: وہ مجھے مکمل طور پر سمجھ لے گی۔

ٹیئر گارٹن کی جنوبی طرف سے گزرتے ہوئے میں آہستہ آہستہ نہر پر پہنچ گیا۔ پُل پر سے مجھے ماریا پوڈر کا مکان صاف نظر آ رہا تھا۔ میں وہاں محض تین بار گیا تھا۔ کھڑکیوں کے چوکھٹوں پر دھوپ چمک رہی تھی جبکہ ان کے پیچھے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے میں پُل کے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر ساکت پانی کو دیکھنے لگا۔ جلد ہی اس پانی میں بارش کے قطروں نے ہلچل مچا دی۔ بہت دور ایک بجرے سے پھل اور سبزیاں اتاری جا رہی تھیں جبکہ دستی گاڑیوں کی ایک طویل قطار پشتے کے ساتھ منتظر تھی کہ ان پر سامان لادا جائے۔ نہر کنارے ایستادہ درختوں سے جھڑنے والے پتے ہوا میں گردش کر رہے تھے۔ یہ تاریک اور بے کیف منظر کس قدر خوبصورت تھا! اوہ، مرطوب موسم میں سانس لینا کس قدر خوب محسوس ہو رہا تھا! جینے کے قابل یہی زندگی ہوتی ہے جو فطرت میں رچی بسی ہو جبکہ وقت سنگ دلی سے آگے ہی بڑھتا رہتا ہے۔ ہر لمحہ سے خوشی کی کشید، ہر ہر لمحہ میں زندگی بھر کے لطف کی تلاش، یہ لمحات مجھ پر یوں منکشف ہو رہے تھے کہ ان کا مدمقابل کوئی نہ تھا۔ میں نے یہ بھی فراموش نہ کیا کہ ایک ایسا شخص موجود تھا جسے میں اپنے تمام خیالات سے آگاہ کر سکتا تھا...... بس مجھے انتظار کرنا تھا......!

اس سے زیادہ خوش کن کیا ہو سکتا تھا؟ جلد ہی میں ہم بارش سے بھیگی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے ہوں گے، ایک تاریک اور پُرسکون جگہ تلاش کرتے ہوں گے، وہاں بیٹھیں گے اور ہماری آنکھیں چار ہوں گی۔ اس کو بتانے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہوگا...... میں اسے وہ سب کچھ بتاتا جس کا میں نے خود سے بھی اعتراف نہ کیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرے خیالات آتے چلے گئے۔ میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا اور انہیں اپنے ہاتھ کے لمس سے گرم کرتا اور میں محض ایک لفظ میں اس کا ہو جاتا۔

تقریباً ساڑھے تین بج چکے تھے۔ مجھے حیرانی یہ تھی کہ ممکن ہے کہ وہ ابھی تک بیدار نہ ہوئی ہو۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ سیدھا اس کے گھر جاؤں اور وہاں انتظار کروں؟ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ لے گی۔ کیا وہ اندازہ لگا لے گی کہ میں اس کا منتظر ہوں؟ کیا وہ واقعی مجھ سے ملاقات کا ارادہ کر رہی تھی؟ میں نے یہ تمام شکوک اپنے ذہن سے جھٹک دیئے

کیوں کہ اس قسم کے سوالات اعتماد کی کمی کو ظاہر کرتے تھے جو نہایت ہی غیر مناسب عمل تھا: میں نے اس کا ایک تصور قائم کیا تھا، ذرا دیر بعد رد کرنے کو۔ لیکن اب مجھے ہزاروں وسوسے آرہے تھے۔ شاید وہ بیمار ہوگئی ہو، شاید وہ میری آمد سے پہلے ہی کسی ضروری کام سے گھر سے نکل چکی ہو۔ یہ سب کچھ ممکن تھا۔ یوں خوشی ملنا قدرتی نہیں ہوسکتا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میرا دل بھی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایسا زندگی میں ایک بار ہی ہوتا ہے...... ایسی رات۔ دوسری کی توقع درست نہیں۔ میں پہلے ہی خود کو تسلی دینے کی تلاش میں تھا۔ میں نے خود سے کہا کہ شاید یہ میری بے وقوفی تھی کہ اپنی زندگی کو نیا راستہ دوں۔ اب مجھے تاریکی ہی تاریکی نظر آرہی تھی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں اپنے پرانی خاموشی کی طرف لوٹ جاؤں، اپنے پرانے معمول کی جانب؟

تاہم، جیسے ہی میں مڑا، وہ مجھے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ ایک پتلی برساتی، ارغوانی رنگ کی ٹوپی، چھوٹی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی جب کہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

''کیا یہیں تم میرے منتظر تھے؟ تمہیں یہاں آئے کتنی دیر ہوئی؟''

''ایک گھنٹہ۔''

میری آواز کانپ رہی تھی۔ اسے شکایت سمجھتے ہوئے اس نے مجھے فہمائش کے انداز میں کہا: ''جناب، اس میں بھی تمہارا ہی قصور ہے کیوں کہ میں گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے تمہاری منتظر ہوں، اور میں نے تمہیں ابھی ہی دیکھا اور یہ بھی محض اتفاق تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہیں ٹھہرنا اور قدرت کی شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے، بجائے اس کے کہ میری عمارت کے سامنے کھڑے ہو!''

تو وہ بھی میرا انتظار کررہی تھی۔ اس سے مراد یہ تھی اب میں اس کے لیے اہم بن چکا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ میں جیسے بلی کا بچہ تھا جسے پچکارا جارہا تھا: ''تمہارا شکریہ۔''

''تم میرا شکریہ کیوں ادا کررہے ہو؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، اس نے اپنا بازو میری بازو میں ڈال دیا۔ ''آؤ، چلتے

ہیں۔''

اور اسی کے ساتھ ہی میں نے ہار مان لی۔ہم قدرے تیز تیز چلنے لگے۔ میں یہ پوچھنے سے ڈر رہا تھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ہم دونوں خاموش تھے۔میں نے اس خاموشی کو کس طرح برداشت کیا حالاں کہ میرا ذہن مجھے کچھ پوچھنے پر مسلسل اکسا رہا تھا۔لیکن میرے خوبصورت خیالات نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔میں نے انہیں تلاش کرنے کی جتنی کوشش کی، میرا ذہن اسی قدر خالی ہوتا گیا۔ میرا دل دھڑکتے دھڑکتے میرے حلق میں آنے لگا۔لیکن جب میں نے اس پر نظر ڈالی، اس کے چہرے پر خفگی کا نشان بھی نہ تھا۔اس کی سیاہ آنکھیں نیچے زمین پر جمی تھیں۔اگر چہ وہ کسی پتھر کی طرح خاموش تھی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی خفیف سی جھلک نمودار ہوگئی جب اس نے اپنا بایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔اپنے دائیں ہاتھ سے وہ کہیں فاصلے پر کسی چیز کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے اس کے چہرے کو دوبارہ دیکھا۔اس کی گھنی بھنویں تنی ہوئی تھیں، وہ یقیناً کسی معاملے پر غور کر رہی تھی۔اس کے پپوٹوں پر مجھے پتلی شریانیں دکھائی دیں۔اس کی لمبی سیاہ پلکیں لرز رہی تھیں جبکہ ان کے کناروں پر بارش کے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔اس کے بال بھیگ رہے تھے۔

اچانک وہ میری طرف مڑی اور کہا،''تم مجھے کیوں دیکھے جا رہے ہو؟''

میں پہلے ہی خود سے یہی سوال پوچھ چکا تھا: میں کس طرح نہایت آسانی سے ایک عورت پر اپنی نظریں جما سکتا تھا جبکہ میں نے پہلے کبھی اس قسم کی حرکت نہیں کی تھی؟ اور کیوں، حالاں کہ اس نے مجھے چیلنج کیا تھا، مجھ میں اس قسم کی جرأت آئی؟ اس وقت بس میں یہی کہہ سکا:

''کیا تم نہیں چاہتی کہ میں تمہیں دیکھوں؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں...... میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی...... ہوسکتا ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے دیکھتے ہی رہو۔ممکن ہے کہ میں اسی وجہ سے تم سے پوچھ رہی ہوں۔''

اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا کر میں نے اس سے پوچھا:''کیا تم جرمن ہو؟''

''ہاں، لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تمہاری رنگت سنہری نہیں اور تمہاری آنکھیں بھی نیلی نہیں۔''

''تم سچ کہتے ہو۔''

دوبارہ، وہ تقریباً مسکرائی لیکن اس بار میں نے اس کی مسکراہٹ میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی۔

''میرا باپ یہودی تھا۔'' اس نے کہا، ''میری ماں جرمن ہے لیکن اس کی رنگت بھی سنہری نہیں۔''

میں نے تجسس کے عالم میں پوچھا، ''تو اس سے مراد یہ ہوئی کہ تم یہودی ہو؟''

''ہاں......لیکن مجھے امید ہے کہ تم یہ پوچھنے پر برا نہیں مانو گے۔کیا تم یہودیوں کے دشمن ہو؟''

نہیں، اس قسم کی کوئی بات نہیں......ہم اس قسم کی دشمنی نہیں رکھتے۔لیکن مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ تم یہودی ہو سکتی ہو۔''

''ہاں، میں یہودی ہوں۔میرے والد کا تعلق پراگ سے ہے لیکن میری پیدائش سے قبل ہی وہ کیتھولک عیسائی ہو گئے تھے۔''

''تو تم خود کو مسیحی کہہ سکتی ہو۔''

''نہیں......مذہب سے میرا کوئی لینا دینا نہیں۔''

ہم کچھ دیر مزید چلتے رہے اور اس نے باتیں کرنا بند کر دیں۔اب اس سے پوچھنے کو میرے پاس کوئی مزید سوال نہ تھا۔ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے شہر کے مضافات کی طرف نکل آئے۔میں حیران تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔میرا خیال نہ تھا کہ وہ اس موسم میں مجھے شہر کے مضافات میں چہل قدمی کے لیے لے آئے گی۔بوندا باندی مسلسل جاری تھی جبکہ چلتے چلتے ماریا نے استفسار کیا: ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''مجھے کیا معلوم۔''

''کیا تمہیں تجسس نہیں؟''

''تم مجھے جہاں لے جاؤ گی، میں چلا جاؤں گا...... جہاں تم چاہو۔''

اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اس کا زرد بھیگا چہرہ شبنم میں نم سفید پھول جیسا تھا: ''تم کس قدر فرمانبردار ہو...... کیا تمہارا اپنا کوئی خیال نہیں؟ کوئی خواہش نہیں؟''

میں نے اسے گزشتہ رات کہی اس کی بات یاد دلائی: ''تم نے مجھے کوئی بھی سوال پوچھنے سے منع کر دیا تھا۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر کہنے لگا: ''یا پھر جو کچھ تم نے گزشتہ رات کہا، اس کا یہ مطلب یہ نہیں تھا؟ یا تم نے اپنی ارادہ تبدیل کر لیا ہے؟''

''نہیں، نہیں!'' وہ قدرے خفگی کے عالم میں زور سے بولی، ''میرا وہی مطلب تھا جو میں نے کہا......''

وہ دوبارہ اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ چلتے چلتے ہم ایک ایسے وسیع باغ میں پہنچ گئے جس کے اردگرد آہنی باڑ لگی ہوئی تھی۔

''کیا ہم اندر چلیں؟''

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''ایک نباتاتی باغ۔''

''تمہاری مرضی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تو پھر اندر چلتے ہیں...... میں ہمیشہ یہاں آتی ہوں، خاص طور برسات میں یہاں آنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

باغ میں کوئی متنفس نہیں تھا۔ ہم کچھ دیر ریتلے راستوں پر محض چہل قدمی کرتے رہے۔ خراب موسم کے باوجود دونوں اطراف ایسے درخت قطار اندر قطار موجود تھے جن کے پتے ابھی نہیں جھڑے تھے۔ راستے میں ہمیں بے شمار ایسے تالاب نظر آئے جن کے گرد کائی سے ڈھکے پتھر، گھاس اور ہر قسم کے رنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ پانی کی سطح پر بڑے بڑے پتے تیر رہے تھے۔ گرین ہاؤسز کے اندر گرم علاقوں کے پودے اور درخت تھے۔ ان کے موٹے تنوں اور ننھے ننھے پتوں کو دیکھتے ہوئے ماریا کہنے لگی: ''یہ برلن کی خوبصورت ترین جگہ ہے۔ سال کے

اس دنوں بمشکل ہی یہاں کوئی آتا ہے۔ یہ خالی ہی ہوتا ہے......اور پھر یہ عجیب وغریب درخت مجھے ان دور افتادہ سرزمینوں کی یاد دلاتے ہیں جنھیں دیکھنے کی مجھے حسرت ہے...... مجھے ان پر ترس آتا ہے...... تمہیں علم ہے کہ مجھے ان پر ترس آتا ہے کیوں کہ انہیں ان کی قدرتی زمین سے اکھاڑ کر یہاں لایا گیا تاکہ یہاں انہیں انتہائی احتیاط سے مصنوعی موسم میں اگایا جائے۔ کیا تمہیں علم ہے کہ برلن میں سال بھر میں محض ایک سو دن ہی سورج نظر آتا ہے جبکہ باقی دو سو پینسٹھ دن موسم ابر آلود ہی رہتا ہے؟ کیا ہاٹ ہاؤسز اور مصنوعی روشنیاں ان پتوں کی نشوونما کے لیے کافی ہیں جنھیں بہت زیادہ حرارت اور روشنی درکار ہوتی ہے؟ تاہم، یہ کسی نہ کسی طرح اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں...... وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر کھلے رہتے ہیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ زندگی کہلا سکتا ہے؟ کہ ایک زندہ پودے کو اس کے وطن سے اکھاڑ کر شدید مصنوعی موسم میں محض اس لیے رکھا جائے کہ کچھ شائقین ان سے لطف اندوز ہو سکیں...... کیا یہ سب ایک قسم کا تشدد نہیں؟''

''لیکن کیا تم بھی ان شائقین میں سے نہیں؟''

''ہاں، لیکن جب بھی میں یہاں آتی ہوں، میں بہت زیادہ اداس ہو جاتی ہوں۔''

''تو پھر تم یہاں کیوں آتی ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

وہ ایک بھیگے بنچ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اپنے چہرے سے بارش کے قطرے صاف کرتے ہوئے وہ کہنے لگی: ''جب میری نظر ان پودوں پر پڑتی ہے، تو پھر میں اپنے متعلق سوچنے لگتی ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ مجھے میرے آباؤ اجداد کی یاد دلاتے ہوں جو انہی سرزمینوں میں رہتے تھے جہاں یہ اجنبی پھول اور درخت صدیوں قبل تھے۔ کیا ہمیں بھی وہاں سے انہی کی طرح اکھاڑا نہیں گیا؟ جلاوطن کر کے ہمیں دنیا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا؟ اگرچہ تمہارے نزدیک اس کا مفہوم وہی نہیں ہو سکتا...... سچ یہ ہے کہ یہ میرے لیے کچھ زیادہ اہمیت کے حامل نہیں...... یہ سوچنے اور غور کرنے کا ایک موقع ضرور فراہم کرتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کسی دوسری جگہ کی نسبت اپنے خیالوں میں زیادہ رہتی ہوں۔ اگر تقابل کیا جائے تو میری

حقیقی زندگی کسی بے کیف خواب سے کم نہیں...... ممکن ہے کہ اٹلانٹک میں تمہیں میرا کام مایوس کن معلوم ہوا ہو لیکن میری کوئی ایک رائے نہیں...... درحقیقت، بعض اوقات میں اس سے بہت لطف اندوز ہوتی ہوں...... میں یہ کام محض اپنی ماں کی وجہ سے کرتی ہوں۔ مجھے اپنی ماں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے اور سال میں چند ایک پینٹنگ بنا کر ہمیں اس سلسلے میں معاونت حاصل ہو جاتی ہے...... کیا تم نے کبھی مصوری کی ہے؟''

''محض کچھ عرصے!''

''تم نے مصوری کیوں چھوڑ دی؟''

''مجھے ادراک ہو گیا تھا کہ مجھ میں اس قسم کی کوئی صلاحیت موجود نہیں۔''

''یہ ممکن نہیں...... جس انداز سے تم گیلری میں تصویر پر نظر جمائے ہوئے تھے، میں بتا سکتی ہوں کہ تم مصوری کر سکتے ہو...... اب تم شاید یہ کہو کہ تم نے دیکھا کہ تم میں ہمت و حوصلے کی کمی ہے۔ لیکن وہ شخص جو کبھی مصوری کرتا تھا، اس کے لیے ختم نہیں ہوتی...... اب میں تمہارے متعلق بات کر رہی ہوں۔ چوں کہ مجھ میں جرأت ہے، میں ایسی تصاویر بنانا چاہتی ہوں جن سے یہ ظاہر ہو کہ میں لوگوں کو کس طرح دیکھتی ہوں اور بعض اوقات ممکن ہے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہوں۔ لیکن یہ بھی بے معنی ہے...... ان لوگوں کی ملامت کا کوئی فائدہ نہیں جو نہیں سمجھتے کہ میرا کام کیا ہے، جبکہ جو لوگ میرے کام کو سمجھتے ہیں، وہ میری ملامت سے کہیں بالا ہیں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ دیگر تمام فنون کی مانند مصوری کسی کے آگے جواب دہ نہیں، اس میں کسی بھی قسم کی خواہشات پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود، جو میں انجام دیتی ہوں، وہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ...... یہ واحد وجہ ہے کہ میں کیوں اپنی تصاویر پر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اس لیے کہ اس صورت میں، میں وہ کچھ نہیں کر سکتی جو میں چاہتی ہوں بلکہ وہ جو لوگ چاہتے ہیں...... بالکل نہیں...... کبھی نہیں۔ اس سے بہتر یہ ہو گا کہ میں سڑکوں پر جسم فروشی کروں...... اور میری وجہ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔''

اس نے میرے گھٹنے پر ایک زوردار مکہ رسید کیا۔ ''سو یوں ہے میرے دوست۔ یوں بالآخر ہمارے درمیان کوئی فرق نہیں۔ تم گزشتہ رات وہاں تھے جہاں نشے میں دھت نوجوان نے میری کمر کا بوسہ لیا تھا، ہے ناں؟ وہ میری کمر کا بوسہ کیوں نہ لیتا...... اسے ہر حق حاصل تھا...... اس

نے رقم خرچ کی تھی......اور لوگ کہتے ہیں کہ میری کمر بہت حسین ہے......کیا تم بھی میری کمر پر بوسہ دینا چاہو گے؟ کیا تمہارے پاس رقم ہے؟''

میں گم صم وہاں بیٹھا رہا۔ میں تیزی سے اپنی آنکھیں جھپکا اور ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے ماریا برہم ہوگئی۔ اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ زرد ہوگیا۔ ''نہیں راعف، میں ایسا نہیں چاہتی...... کچھ بھی مگر ایسا نہیں...... میں ترس و ترحم برداشت نہیں کرسکتی......جس لمحے میں نے خود پر تمہیں ترس کھاتے دیکھا، اسی لمحے میں تمہیں الوداع کہہ دوں گی......تم میرا چہرہ دوبارہ کبھی نہیں دیکھو گے......''

یہ دیکھتے ہوئے کہ مجھے کس قدر صدمہ ہوا تھا، یہ دیکھتے ہوئے کہ میں تھا جس پر ترس کھایا جاتا، اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ''اسے دل پر نہ لو۔'' اس نے کہا، ''بات صرف یہ ہے کہ ہمیں ان باتوں کے اظہار میں ہچکچانا نہیں چاہیے جو بعدازاں ہمارے تعلقات کو نقصان پہنچائیں۔ ایسے موقع پر بزدلی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے......اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اگر ہمیں معلوم ہوجائے کہ ہم اکٹھے نہیں چل سکتے، تو ہم ایک دوسرے کو الوداع کہیں گے اور اپنا اپنا راستہ لیں گے......اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟ زندگی کا حاصل تنہائی ہے، کیا تمہارا بھی یہی خیال نہیں؟ تمام بندھن جھوٹ پر استوار ہوتے ہیں۔ لوگ محض ایک حد تک ہی ایک دوسرے کو جان سکتے ہیں اور باقی پھر وہ خود ہی اندازہ لگا لیتے ہیں اور ایک دن اپنی غلطی دیکھتے ہوئے، وہ افسردگی سے دامن چھڑاتے اور بھاگ جاتے ہیں۔ اگر ان کا اپنے خوابوں پر یقین ہوتا اور صرف اس پر ہی عمل کرتے جو ممکن ہوتا تو تب وہ کیا ایسا کرتے؟ اگر ہر کوئی فطرت کو مان لیتا تو پھر کسی کو مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑتا، کوئی قسمت کو نہ کوستا۔ ہمیں ہر حق حاصل ہے کہ ہم اپنی صورتِ حال کو قابل رحم سمجھیں لیکن ہمیں اپنے ترس کو دوسروں سے چھپانا چاہیے۔ دوسروں پر ترس کھانے سے مراد احساسِ برتری میں مبتلا ہونا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہم دوسروں سے برتر ہیں یا پھر دوسرے ہم سے کہیں زیادہ بدقسمت یا کمتر ہیں......کیا ہمیں اب چلنا چاہیے؟''

ہم دونوں کھڑے ہوگئے اور ہم نے اپنی برساتیوں سے بارش کے قطرے جھٹکے۔ گیلی ریت ہمارے قدموں کے نیچے چرچرانے لگی۔

رات ہو رہی تھی لیکن لیمپ پوسٹ ابھی روشن نہیں ہوئے تھے۔ جس راستے سے ہم آئے تھے، اسی پر ہم تیزی سے واپس گامزن ہو گئے۔ اس بار میں نے اپنا بازو اس کے بازو میں ڈال دیا۔ کسی ننھے بچے کی طرح میں اس سے لپٹا چلا جا رہا تھا، میرا سر اس کے قریب تھا جبکہ میری خوشی میں افسردگی کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں خوش تھا کہ اس کی سوچ بھی بالکل مجھ جیسی تھی اور ہم پہلے ہی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ لیکن میں خوف زدہ تھا...... کہ ایک روز وہ مجھے چھوڑ دے گی یا پھر سچ کو مجھ سے چھپائے گی۔ تو پھر ہم، کسی بھی قیمت پر جھوٹ پر زندگی گزارنے پر راضی نہیں ہوں گے۔ اور پھر اندر ہی اندر میں ایک مدھم آواز سن سکتا تھا جو مجھے تنبیہ کر رہی تھی: جب تم نے اس کی حقیقت کو دیکھ لیا...... جب تم نے عریاں حقیقت کو قبول کر لیا...... تو قطع نظر وہ کون ہے: دوستی مزید ممکن نہیں رہے گی۔

چوں کہ میری کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں حقیقت کو برہنہ دیکھوں۔ کیوں کہ مجھے علم تھا کہ میں کسی ایسی سچائی کو برداشت نہیں کر سکوں گا جو مجھے اس سے دور لے جائے۔ ہم نے ایک دوسرے میں بہت سے قیمتی خزانے پا لیے تھے۔ کیا یہ کہیں زیادہ مہربانی ہوتی کہ ایک دوسرے کے لیے ہم خدا ترسی کا مظاہرہ کرتے، چھوٹی باتوں پر آنکھیں بند کر لیتے اور عظیم سچائیوں کے لیے معمولی سچائیاں قربان کر دیتے؟

وہ مضبوط فیصلہ کی حامل ایک ایسی عورت تھی جس نے مشکل حالات سے نبرد آزمائی سے سبق حاصل کیا اور وہ دوسروں کو یہ سبق بطور نصیحت پڑھاتی تھی۔ اس نے مشکل حالات میں کام شروع کیا تھا اور اپنے ارد گرد لوگوں کو نقصان اٹھاتے اور مرتے دیکھا تھا۔ فطری طور پر وہ یہی اندازِ فکر اپناتی۔ اسے اس صحبت سے نفرت تھی جو اس کا انتخاب نہ ہوتی، اور وہ اسے پسند بھی نہ کرتی۔ زبردستی مسکراہٹوں پر مبنی زندگی نے اسے شکی مزاج بنا دیا تھا جبکہ میں نے عمر بھر دوسروں سے اپنا فاصلہ قائم رکھا تھا۔ میں نے ان کی قطعی پروا نہیں کی تھی اور انہوں نے بھی میری قطعی پروا نہیں کی تھی، اس لیے مجھے ان لوگوں سے کوئی ناراضی نہیں تھی۔ یہ صرف تنہائی ہی تھی جس نے مجھے کھا لیا، جس نے مجھے ختم کر دیا تھا اور یہی تنہائی تھی جس نے مختلف طریقوں سے مجھے میری ذات سے غداری کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اب ہم شہر کے مرکز میں پہنچ چکے تھے۔ سڑکیں خوب روشن ہو چکی تھیں جبکہ آمد و رفت بھی خوب جاری تھی۔ ماریا پوڈرا اپنے ہی خیال میں گم اور شاید قدرے افسردہ بھی تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے استفسار کیا: ''کیا کوئی چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو میرے لیے پریشان کن ہو۔ درحقیقت، میں اس چہل قدمی سے بہت خوش ہوئی ہوں۔ کم از کم میں سمجھ رہی ہوں کہ میں خوش ہوں......''

اب یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی آنکھیں مجھے چیر رہی ہوں۔ اس کی مسکراہٹ بھی مجھے قدرے عجب سی معلوم ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ سڑک کے درمیان رک گئی اور کہنے لگی: ''میں گھر نہیں جانا چاہتی۔ آؤ، کچھ کھاتے ہیں۔ ہم اس وقت تک باتیں کر سکتے ہیں، جب تک کہ میرا کام پر جانے کا وقت ہو جائے۔''

میں اس کی اس غیر متوقع پیشکش پر اچھل پڑا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اس نے میری حالت بھانپ لی تھی، میں نے بلا تاخیر خود کو سنبھال لیا۔ ہم شہر کے مغرب میں واقع ایک مناسب سے ریستوران میں چلے گئے۔ اس میں زیادہ رش نہ تھا۔ ایک کونے میں روایتی لباس میں ملبوس بلویری نسوانی بینڈ پوری آواز سے نغمہ سرا رہا تھا۔ ہم نے ایک میز سنبھالی اور کھانا اور وائن طلب کیے۔

لیکن اس وقت میری ساتھی کا ماند پڑتا جذبہ وشوق مجھ میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ میں بغیر کسی وجہ کے خود کو بے زار اور بے چین محسوس کرنے لگا تھا۔ میرے مزاج میں تبدیلی محسوس کرتے ہوئے اس نے خود کو خیالات کے ہجوم سے باہر نکالنے کی کوشش کی اور قدرے مجھ سے کھلنے لگی۔ مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے وہ میز پر جھکی اور میرے ہاتھ پر ہلکی سی چپت رسید کی: ''تم نے منہ کیوں بسور رکھا ہے؟ ایک نوجوان خاتون کے ساتھ اپنے پہلے کھانے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک نوجوان مرد کو تو کہیں زیادہ پُرجوش ہونا چاہیے!'' اس کا لب ولہجہ ہلکا پھلکا تھا لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنی کہی بات پر خود بھی یقین نہیں۔ جلد ہی وہ پھر اپنے خیالات میں گم ہو گئی۔ خود کو کسی طرح مصروف رکھنے کو اس نے دوسری میزوں کی طرف نظریں دوڑائیں۔ وائن کے چند

گھونٹ لینے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا: ''میں کیا کر سکتی ہوں! کیا! یہی تو بات ہے......
میں ایسی ہی ہوں، نہیں بدل سکتی!''

وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہی تھی؟ میں نے اسے کچھ تاریک ہی جانا۔ اس وقت وہ جو کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی، وہی چیز مجھے افسردہ کیے دے رہی تھی۔ یہ میں جانتا تھا۔ لیکن میری فہم یہاں رک گئی۔

جہاں کہیں بھی اس کی نظریں ٹھہرتیں، وہ اپنی نظریں وہاں سے ہٹانے میں ناکام رہتی۔ گاہے گاہے مجھے اس کے چہرے پر خفیف سا لرزہ معلوم ہوتا جو کی صدف کی مانند زرد تھا۔ اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ اب اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی کہ جیسے وہ اپنے ہیجان کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو: ''برا مت ماننا۔ کھوکھلی امیدوں میں اپنی ذات کھو دینے سے بہتر ہے کہ اپنی ذات کو مکمل طور پر کھول کر رکھ دو......لیکن برائے کرم، برا مت ماننا......گزشتہ رات میں تمہارے پاس آئی......میں نے تمہیں کہا کہ پیدل گھر چلتے ہیں......آج میں نے تمہیں چہل قدمی کی پیشکش کی......میں نے کہا کہ کھانا کھاتے ہیں......میں نے تمہیں تنہا محسوس نہیں ہونے دیا......لیکن مجھے تم سے محبت نہیں......میں کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے تم پُرکشش لگتے ہو، تم میں وہ خوبیاں ہیں جو میں نے کسی دوسرے شخص میں کبھی نہیں دیکھیں، لیکن بس......تم سے بات کرنا، تم سے ہر موضوع پر بات کرنا، تم سے الجھنا، لڑنا......پھر صلح بھی کر لینا......ان سب چیزوں نے مجھے خوشی دی......لیکن محبت؟ یہ میرے بس کا روگ نہیں......اب تم مجھ سے پوچھ سکتے ہو کہ میں یہ سب کچھ اچانک اس قدر صاف انداز میں کیوں کہہ رہی ہوں......اس لیے مجھے بتانے دو کہ میں نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے کسی بھی قسم کی امیدیں وابستہ کر لو اور کہیں بعد میں جا کر برا مان جاؤ۔ میں تم پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں تمہیں کیا دے سکتی ہوں اور کیا نہیں کیوں کہ میں نہیں چاہتی کہ اگر میں تمہاری توقعات پر پوری نہ اتروں تو تم بعد میں مجھ پر الزام تراشی کرو کہ تم تو مجھ سے کھیلتی رہی ہو۔ کتنے ہی مختلف سہی، تم بھی مرد ہو......اور جن مردوں کو اب تک میں جانتی ہوں، انہوں نے تب دکھ یا ناراضی کا اظہار کیا جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں ان سے محبت نہیں کرتی اور ان سے کبھی محبت کر ہی نہیں سکتی تھی......لیکن کیوں، جب انہوں نے مجھے الوداع کہا، تو انہوں نے مجھے موردِ الزام سمجھا؟ چوں کہ میں نے

انہیں وہ چیز نہیں دی، جسے نہ دینے کا میں نے ان سے وعدہ کیا تھا، یا پھر انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہو سکتی ہے؟ کیا یہ نا انصافی نہیں تھی؟ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی میرے لیے اسی طرح سوچو...... تم اس بات کو اپنے حق میں سمجھ سکتے ہو......''

اس کے الفاظ میرے لیے کسی صدمہ سے کم نہ تھے۔ خود پر قابو پانے کی کوشش ہوئے، میں نے کہا: ''یہ سب کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نہیں بلکہ تم ہو جو ہماری دوستی کی شرائط طے کر رہی ہو۔ تاہم جیسا تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔''

وہ غصہ کے عالم میں احتجاج کرتے ہوئے کہنے لگی: ''نہیں، نہیں، اس سے مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ دیکھو، تم سمجھتے کیوں نہیں؟ تم ان تمام مردوں کی طرح کر رہے ہو...... یوں جیسے تم میری شرائط قبول کر کے میری پسندیدگی حاصل کر سکو گے۔ میرے دوست، نہیں! تم مجھے خوبصورت الفاظ کی بھول بھلیوں میں نہیں الجھا سکتے۔ سوچو۔ میں نے کوشش کی کہ سب کچھ تمہیں صاف بتا دوں خواہ یہ سب میرے خلاف ہی جاتا ہو، چاہے یہ دوسروں کے خلاف ہو۔ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے، یہ کہ ہم ایک دوسرے سے کیا چاہتے ہیں جبکہ ہمارے جذبات اس قدر مہمل ہوتے ہیں کہ ہمیں بمشکل معلوم ہو پاتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم اسی جذباتی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ اگر مجھے وہ کام کرنے پڑیں جو میرے نزدیک غیر ضروری اور غیر اطمینان بخش ہوں تو پھر میں خود سے نفرت ہو جاتی ہے...... لیکن عورتوں کی جس بات سے مجھے سب سے زیادہ نفرت ہے، وہ یہ ہے کہ خواتین ہمیشہ ہر چیز خاموشی سے برداشت کر لیتی ہیں...... کیوں؟ ہمیشہ ہم ہی کیوں دور بھاگتی ہیں اور ہمیشہ تم مرد ہی کیوں ہمارا تعاقب کرتے ہو؟ کیا وجہ ہے کہ ہم ہر بار ہار مان لیتی ہیں اور تم ہر بار ہی فائدہ میں رہتے ہو؟ کیا وجہ ہے کہ تمہاری درخواست میں بھی حکم پوشیدہ ہوتا ہے اور ہمارے انکار میں ترس و ترحم ہوتا ہے؟ میں اس صورتِ حال کو اپنے بچپن سے ہی للکار رہی ہوں۔ میں نے یہ صورتِ حال کبھی قبول نہیں کی، کبھی بھی نہیں۔ میں ایسا کیوں کروں؟ یہ سب کچھ میرے لیے اس قدر اہم کیوں ہے جبکہ دیگر عورتیں اس کو محسوس تک نہیں کرتیں؟ میں نے اس کے متعلق بہت زیادہ سوچا ہے۔ میں نے اکثر خود سے پوچھا کہ کیا یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ میری پرورش اس اثر و رسوخ

اور دباؤ سے بہت دور ہوئی جن کے باعث اکثر خواتین اپنی قسمت پر شاکر ہو جاتی ہیں۔ میرے والد میرے بچپن میں فوت گئے تھے۔ گھر میں، میں اور میری والدہ ہی تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک اطاعت شعار خاتون تھیں۔ وہ تنہا زندگی گزارنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھیں یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ صلاحیت حاصل ہی نہیں کی تھی۔ سات برس ہی کی عمر سے میں نے تمام انتظام سنبھال لیا تھا، میں ہی تھی جو اُن کی رہنمائی کرتی، انہیں مشورے دیتی اور انہیں معاونت فراہم کرتی۔ ہم پر کوئی مرد حکم چلانے کو موجود نہیں تھا اور عین اسی طرح میں اپنی ہم جماعتوں کے بے کار خوابوں کو ٹھکرا دیتی۔ میں نے کبھی نہیں سیکھا...... یا سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ لڑکوں کو کیسے پسند آؤں۔ لڑکوں کے سامنے نہ کبھی میرا چہرہ سرخ ہوا، نہ میں نے ان کی طرف سے تعریف چاہی۔ اس صورتِ حال نے مجھے بری طرح تنہا کر دیا۔ میری سہیلیوں کو بھی مجھ میں کوئی قدرِ مشترک تلاش کرنے میں مشکل پیش آتی۔ انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اپنی حقیقی ذات کو اپنائیں بلکہ وہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنی خواہشات کی اسیر ہو جائیں اور گڑیوں جیسی بن جائیں۔ میں تو لڑکوں سے بھی دوستی نہیں کر سکی تھی۔ وہ نرمی تلاش کرتے اور جب وہ انہیں دکھائی نہ دیتی، جب ان کی امید ٹوٹ جاتی، جب وہ دیکھتے کہ میں ان کے برابر ہوں، وہ بھاگ جاتے۔ تب ہی میں یہ خوبی سمجھ سکی کہ مرد کہاں سے اپنی طاقت اور عزم حاصل کرتے ہیں؛ اس کرۂ ارض پر کوئی دوسری مخلوق ایسی نہیں جو اس قدر آسانی سے کامیابی حاصل کر سکے اور اس کرۂ ارض پر اس جیسی کوئی دوسری مخلوق اس قدر متکبر اور انا پرست نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ مخلوق بزدل بھی ہے اور اپنے راستے اسی طرح نکالتی ہے۔ جب میں اس سب سے آگاہ ہوگئی تو پھر میرے لیے کسی مرد سے حقیقی محبت کرنا ناممکن ہوگیا۔ حتیٰ کہ جن سے مجھے بہت زیادہ محبت تھی، اور جن کے ساتھ بہت کچھ مشترک تھا...... ایک لمحہ آتا جب کسی معمولی بات پر خفا ہو کر ان کے بھیڑیے جیسے دانت باہر نکل آتے؛ ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے ہونے کے بعد اور ایک دوسرے کو برابر کی خوشی فراہم کرنے کے بعد، وہ میرے مقابل اکٹھے ہو جاتے، احمقانہ طور پر آہیں بھرتے، مجھ سے معذرت طلب کرتے یا پھر میری حفاظت کی پیشکش کرتے، اور یوں مجھ پر واضح کر دیتے کہ انہوں نے اپنی نظر میں مجھے فتح کر لیا ہے...... درحقیقت وہ خود کو عیاں کر دیتے تھے کہ وہ کس قدر قابلِ رحم تھے۔ اس مرد سے زیادہ بدنصیب اور مضحکہ خیز کوئی ہو ہی نہیں

سکتا جو جذبات کی رو میں بہ جائے۔ اور اس کے ساتھ وہ خود کو بہت متکبر محسوس کرتے ہیں اور اسے اپنی مردانگی کا ثبوت سمجھتے ہیں۔ اف میرے خدا، کسی شخص کو پاگل کر دینے کو یہی کافی ہے...... اگر چہ مجھے علم ہے کہ مجھ میں کوئی خلافِ فطرت رجحان نہیں، ممکن ہوتا تو میں کسی مرد کی بجائے کسی عورت کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔''

وہ رک گئی اور میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس نے وائن کے چند گھونٹ لیے۔ اس کی خود کلامی نے اس کی برہم مزاجی کو خوشگوار بنا دیا تھا۔

''تم اس قدر حیران کیوں ہو؟'' اس نے پوچھا، ''فکر مت کرو، یہ ایسا نہیں جس طرح تم سوچ رہے ہو۔ اگر چہ میری خواہش تھی کہ میں اس طرح ہوتی۔ یقینی طور پر میں کچھ ایسا کر سکتی تھی جو روح کو بہت گھٹیا بنا دے...... جس طرح تمہیں معلوم ہے، میں محض ایک مصور ہوں...... میرے نزدیک خوبصورتی کا اپنا ایک معیار ہے...... میرا نہیں خیال نہیں کہ کسی عورت سے محبت کرنا خوبصورتی کے زمرے میں آتا ہو...... میں یہ بات کس طرح بیان کروں...... جمالیات غلط ہے...... میں نے ہمیشہ ایسا رویہ اپنانے سے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا جو فطرت کے خلاف ہو...... یہی وجہ ہے کہ میرا خیال ہے مجھے قطعی طور پر کسی مرد سے محبت کرنے کی ضرورت ہے...... لیکن وہ مرد، حقیقی مرد ہونا چاہیے...... کوئی ایسا مرد جو اپنی ظالمانہ قوت استعمال کیے بغیر مجھے جذبات میں بہا سکے...... مجھ سے کچھ چاہے بغیر، مجھ پر قابو پائے بغیر، یا میری تذلیل کیے بغیر مجھے جذبات میں بہا سکے، ایسا مرد جو مجھ سے محبت کر سکے اور میرے پہلو میں چل سکے...... دوسرے الفاظ میں، ایک حقیقی طاقتور مرد، ایک حقیقی مرد...... اب کیا تم سمجھ رہے ہو کہ میں تم سے کیوں محبت نہیں کر سکتی؟ کسی بھی طرح زیادہ دیر تک گزری لیکن تم وہ شخص نہیں ہو جس کی مجھے تلاش ہے...... سچائی تو یہ ہے کہ تم میں اس قسم کا کوئی تکبر موجود نہیں جس کے متعلق میں بات کر رہی تھی...... تم تو کسی بچے بلکہ کسی عورت جیسے معلوم ہوتے ہو۔ کوئی ایسی عورت جو میری ماں جیسی ہو...... تمہیں کوئی ایسی خاتون چاہیے جو تمہاری دیکھ بھال کر سکے...... میں وہ خاتون ہو سکتی ہوں...... اگر تم چاہو...... لیکن اس سے زیادہ نہیں...... ہم شاندار دوست ہو سکتے ہیں...... تم وہ پہلے شخص ہو جس نے مجھے پریشان نہیں کیا یا جس نے مجھے اپنے خیالات سے بھٹکانے کی کوشش نہیں کی یا جس نے میرے گرد گھیرا تنگ کرنے کی

کوشش نہیں کی۔ یہ کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ تم وہ پہلے شخص ہو جس نے وہ سب کچھ سنا جو مجھے کہنا تھا، تم نے مجھے مجبور نہیں کیا کہ میں وہ سب کچھ نہ کہہ سکوں جو مجھے کہنا تھا...... مجھے تمہاری آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے سمجھتے ہو...... اسی طرح، جس طرح میں نے کہا کہ ہم شاندار دوست ہو سکتے ہیں۔ جس طرح میں تم سے بے تکلفی کے عالم میں بات کر رہی ہوں، تم بھی مجھے سب کچھ بتا سکتے ہو۔ کیا یہ کافی نہیں؟ کیا ہم اس لیے اسے کھو دیں کہ ہم دونوں کچھ زیادہ ہی چاہتے تھے؟ یہ آخری چیز ہوگی جو میں چاہوں۔ میں نے تمہیں گزشتہ رات بتایا کہ میں بھی برہمی کا اظہار کر سکتی ہوں...... لیکن اس سے تمہیں کوئی غلط نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے...... جہاں تک بنیادی نکات کا تعلق ہے، میں اس بارے میں کبھی اپنا ذہن نہیں بدلوں گی...... اس لیے مجھے بتاؤ، کیا تم میرے دوست بنو گے؟''

اب میں اس صورتِ حال پر غور کر رہا تھا...... آخری چیز جس کی مجھے خواہش تھی کہ میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جاؤں اور میں نے محسوس کیا کہ جو کچھ بھی میں کہوں گا، بہت ہی حتمی اور فیصلہ کن ہو گا۔ اس وقت میری محض ایک ہی خواہش تھی: میں اس کے قریب رہوں، خواہ مجھے اس کی کس قدر ہی قیمت ادا کرنی پڑے...... اس کے علاوہ کوئی بھی چیز میرے لیے اہم نہ تھی...... مجھے عادت نہیں تھی کہ میں کسی شخص سے وہ کچھ پوچھوں جو وہ بتانا نہ چاہے۔ تاہم، اس وقت میرا دل عجب انداز میں بوجھل ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ، غلافی اور ملتجیانہ آنکھوں پر اپنی نظریں جماتے ہوئے میں نے اپنے الفاظ کہنے کی تیاری کر لی: ''ماریا، میں تمہیں پوری طرح سمجھتا ہوں...... میں ادراک کر سکتا ہوں کہ ماضی میں تمہیں اس قسم کی وضاحتیں دینی پڑیں اور مجھے اس خیال سے بہت خوشی ہے کہ تم سب اس لیے کر رہی ہوتا کہ ہمارے مستقبل کے تعلقات متاثر نہ ہوں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے نزدیک ہماری دوستی قیمتی ہے......''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی: ''ممکن ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ لیکن تمہیں کیوں کر علم ہو سکتا ہے؟ ہماری تو ابھی ملاقات ہوئی ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم احتیاط کریں...... میرا تجربہ تم سے بہت کم ہے۔ میرے احباب کا حلقہ بہت ہی محدود ہے اور میں ہمیشہ تنہا ہی رہا ہوں۔ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم ایک ہی جگہ پہنچے

ہیں لیکن الگ الگ سڑکوں سے : ہم دونوں ہی کسی کی تلاش میں ہیں، ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جسے ہم اپنا کہہ سکیں...... یہ بات کس قدر حیران کن اور شان دار ہو گی اگر ہم یہ شخص ایک دوسرے میں پا سکیں...... یہ انتہائی اہم امر ہے جبکہ باقی ہر چیز کی حیثیت ثانوی ہے...... جہاں تک تم نے مرد اور عورت کے درمیان تعلقات کی بات کی، تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ میں اس قسم کا مرد نہیں جس سے تم خوف زدہ ہو۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اب تک اس طرح کی کوئی واردات پیش نہیں آئی۔ لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میں کسی سے محبت کر سکتا تھا، جب تک میں اس میں وہی احترام اور قوت محسوس نہ کر لوں جو میں خود میں محسوس کرتا ہوں۔ تم نے کہا کہ تمہاری تحقیر کی گئی۔ میرے خیال میں کوئی بھی شخص جو اس قسم کا کام کرتا ہے، اپنی ذات سے انکار کرتا ہے اور بلاشبہ اپنی ہی تحقیر کرتا ہے۔ مجھے بھی قدرتی اور فطری دنیا سے پیار ہے؛ درحقیقت، میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ میں لوگوں سے جس قدر دور رہوں گا، میں فطرت اسے اتنا ہی نزدیک ہوں گا۔ میرا ملک دنیا کے خوبصورت ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ان تمام تہذیبوں سیکھا جنہیں عروج وزوال حاصل ہوا۔ دس یا پندرہ صدیوں قبل زیتون کے درختوں کے نیچے دراز میں ان لوگوں کے متعلق سوچتا جنہوں نے زمانوں میں اپنے لیے ثمرات حاصل کیے۔ ہمارے پہاڑ صنوبر کے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے...... ڈھلانی چٹانیں جہاں لگتا تھا کہ کوئی انسان نہیں پہنچ سکا تھا...... اور پھر میرا سامنا سنگ مرمر کے ٹکڑوں اور نقشیں ستونوں سے ہوتا۔ یہ میرے بچپن کی یادیں ہیں، انہی یادوں نے میرے خوابوں کی نشوونما کی۔ میرے ذہن میں قدرت کی منطق بہت بلند اور ارفع مقام کی حامل ہے۔ اس لیے ہمیں یہ سب کچھ فراموش کر دینا چاہیے اور ہمیں اپنی دوستی کو فطری انداز میں پروان چڑھنے دینا چاہیے۔ ہمیں یہ کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ جھوٹے راستے پر چلیں یا اسے اپنے پیشگی فیصلوں سے مشروط کر لیں۔''

ماریا نے اپنی انگشت شہادت سے میرے ہاتھ کو دبایا۔ ''تم اتنے بھی بچے نہیں ہو، جیسا میرا خیال تھا۔'' اس نے کہا۔ مشوش آنکھوں سے اس نے میرا جائزہ لیا۔ اس کا موٹا نچلا ہونٹ بالائی ہونٹ کی نسبت کہیں زیادہ آگے کو نکلا ہوا تھا جس کے باعث وہ ایک ایسی لڑکی نظر آ رہی تھی کہ وہ ابھی رو دے گی۔ لیکن اس کی آنکھیں فکر انگیز اور متجسس تھیں اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ

کس قدر تیزی اور ڈرامائی انداز میں اپنے تاثرات تبدیل کرنے پر قدرت رکھتی تھی۔

''تم مجھے اپنی زندگی اور ملک کے متعلق تمام باتیں بتا سکتے ہو، ان زیتون کے درختوں کا ذکر ایک طرف۔'' وہ کہنے لگی، ''اور میں تمہیں اپنے بچپن کی چند باتیں بتا سکتی ہوں اور یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ مجھے اپنے والد کے متعلق کیا یاد ہے۔ میرا نہیں خیال کہ ہمیں ان چیزوں کی تلاش میں کوئی مسئلہ پیش آئے گا جن کے متعلق ہم گفتگو کر سکتے ہیں...... لیکن یہاں ان کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں چند ہی گاہک ہیں...... اور یہ قابلِ رحم بینڈ...... انہیں امید ہے کہ جو شور وہ کریں گے، اس سے کوئی اور نہیں تو ان کے افسران ضرور خوش ہوں گے۔ اوہ، تم تو جانتے ہی ہو کہ اس قسم کے مقامات کے افسران کس قسم کے ہوتے ہیں!''

''کیا وہ بہت غیر مہذب ہوتے ہیں؟''

''اوہ، ہاں، خاصے۔ ایسی جگہوں پر تم مردوں کو قریب سے دیکھتے ہو۔ مثال کے طور پر اٹلانٹک میں ہمارا باس۔ وہ بہت خوش اخلاق انسان ہے۔ وہ نہ صرف گاہکوں کے ساتھ اچھا ہے بلکہ ان خواتین کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے جن کے ساتھ وہ کام نہیں کرتا...... اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر میں کیبرے میں کام نہ کر رہی ہوتی تو وہ مجھ سے کسی نواب زادی کی طرح فلرٹ کرتا یہاں تک کہ میں اس کے شائستہ انداز و اطوار دیکھ کر مائل نہ ہو جاتی۔ لیکن جب رقم کا معاملہ ہو، وہ ایک مختلف آدمی بن جاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اپنے اس رویے اور طرزِ عمل کو وہ ''کام کی اخلاقیات'' کہے گا۔ اسے ''آمدن کی اخلاقیات'' کا نام دینا بہتر ہوگا۔ کیوں کہ تب ہمارے ساتھ اس کی ناشائستگی، ظالمانہ بلکہ نامعقولیت پر مبنی ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے کام کی سنجیدگی برقرار رکھنے سے کہیں زیادہ اس خوف سے ابھرتی ہے کہ وہ کہیں دھوکا نہ کھا جائے۔ وہ ایک اچھا باپ اور ایک ایمان دار شہری ہے لیکن اگر تم یہ دیکھ سکو کہ وہ ہمیں کیسے بیچنے کی کوشش کرتا ہے...... نہ صرف ہماری آوازیں اور مسکراہٹیں اور بدن بلکہ ہماری انسانیت بھی...... تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے......''

اس پر مجھے دور کا خیال آیا۔ ''تمہارے والد کیا کرتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا نہیں؟ وہ وکیل تھے۔ تم نے یہ کیوں پوچھا؟ کیا تم حیران ہو رہے

کہ میں اس حالت کو کیسے پہنچی؟''

میں چپ رہا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی تک جرمنی کو ٹھیک سے نہیں جان پائے ہو۔ میرے حالات خلافِ معمول نہیں۔ وہ رقم جو والد چھوڑ گئے تھے، اس کی مدد سے میں سکول میں داخل ہو گئی۔ ہم زیادہ مفلس نہیں تھے۔ جنگ کے دوران میں نے نرسنگ کی۔ پھر میں نے اکیڈمی چلی گئی۔ ہماری جمع پونجی افراطِ زر کی نذر ہو گئی۔ اب مجھے دولت کمانا تھی۔ میں کوئی شکوہ وشکایت نہیں کر رہی۔ کام کرنے میں کوئی برائی نہیں کہ جب تک کام کی نوعیت گھٹیا نہ ہو۔ جو چیز مجھے پریشان کر رہی تھی، وہ یہ کہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا جو ہمیشہ نشے میں دھت اور ہوس کے مارے ہوتے...... وہ ایسی نظروں سے دیکھتے...... میں ان نظروں کو محض حیوانی نہیں کہہ سکتی...... کیوں کہ یہ بھی فطری ہے...... لیکن یہ اس سے کچھ گھٹیا درجے کا تھا...... ایک درندگی، جو ظلم، ریاکاری اور فریب کا مجموعہ تھی...... قابلِ نفرت......''

اس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ آرکسٹرا پہلے سے کہیں بلند آواز میں بج رہا تھا۔ روایتی بلویری لباس میں ملبوس ایک خاتون جس کے بال مکئی کے بھٹے جیسے تھے، گھوم پھر کر ایک طربیہ پہاڑی لوک گیت گا رہی تھی۔

''آؤ، ہم کسی خاموش جگہ بیٹھ جائیں...... ہم بہت جلد پہنچ گئے ہیں۔'' ماریا نے کہا۔ پھر وہ مجھ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہنے لگی: ''کیا میں تمہیں بیزار کر رہی ہوں؟ میں تمہیں دن بھر اپنے ساتھ گھسیٹی پھری اور تمہارے کان کھاتی رہی ہوں۔ کسی عورت کے لیے بہتر نہیں کہ وہ اس قدر دوستانہ رویہ اختیار کرے...... میں سنجیدہ ہوں...... اگر تم بیزاری محسوس کر رہے تو تمہیں میری طرف سے اجازت ہے، تم جا سکتے ہو۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے جواب دینے سے پہلے ایک لمحہ توقف کیا۔

میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ تاہم ایک ایسا مرحلہ ضرور آیا جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری کیفیت سے آگاہ ہو گئی تھی۔ پھر میں نے کہا: ''میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔''

''میں بھی یہی محسوس کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا اور اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔

جب ہم سڑک پر باہر نکلے تو وہ کہنے لگی، ''آؤ، ہم ایک ایسے کافی ہاؤس جا سکتے ہیں جو یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ یہ بہت شاندار جگہ ہے، وہاں پاگل ہی پاگل ہیں۔''

''رومانشیز کیفے؟''

''ہاں، کیا تم جانتے ہو؟ کیا تم کبھی وہاں گئے ہو؟''

''نہیں، میں نے اس کے متعلق صرف سنا ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''ان دوستوں سے سنا ہوگا جو مہینے کے آخر میں کنگال ہو جاتے ہیں؟''

میں مسکرایا اور نظر چرالی۔

اس کیفے میں عام طور پر فنکار ہی کثرت سے آیا کرتے تھے لیکن گیارہ بجے کے بعد وہ ان دولت مند عورتوں سے بھر جاتا جو یہاں نوجوانوں کا شکار کرنے آتیں اور میں نے سنا تھا کہ عمر رسیدہ عورتوں کے ہر عمر کے عاشق یہاں آتے اور قسمت آزمائی کرتے تھے۔

ابھی گیارہ بجنے میں بہت دیر تھی، اس لیے یہاں فنکاروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے گرما گرم بحث میں مصروف تھے۔ مختلف ستونوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم دوسری منزل پر پہنچ گئے جہاں تلاش بسیار کے بعد ہمیں ایک خالی میز مل ہی گئی۔

ہمارے اردگرد نوجوان مصور بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے فرانسیسیوں کی نقالی میں لمبے بال رکھے ہوئے تھے۔ وہ پائپ پی رہے تھے جبکہ انہوں نے چوڑے کنارے والے ہیٹ پہن رکھے تھے۔ علاوہ ازیں یہاں وہ ادیب و مصنف بھی موجود تھے جو اپنے لمبے ناخنوں والی انگلیوں سے ورق گردانی کر رہے تھے۔

ایک طویل قامت سنہری رنگت والا نوجوان جس کی قلمیں اس کی ٹھوڑی تک آ رہی تھیں، سامنے کے کمرے سے نکلا اور ہماری میز کی طرف آیا۔

''فرکوٹ والی میڈونا کو میرا سلام و آداب!'' وہ خوشی کے عالم میں چلا کر بولا۔ پھر ماریا کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس کے چہرے اور ماتھے کا بوسہ لیا اور پھر اس کے رخسار بھی چومے۔

میں نے اپنی نظریں جھکا لیں اور انتظار کرنے لگا کہ کب ان کی گفتگو ختم ہو۔ میں نے

اندازہ لگایا کہ وہ اسی نمائش میں کام کرتے تھے۔ بعدازاں، ماریا کے ساتھ زوردار مصافحہ کرنے کے بعد وہ میری طرف مڑا۔ اس نے مجھے بوہیمین انداز میں الوداع کہا اور چلا گیا۔

میری نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں جب وہ مجھ سے کہنے لگی: ''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے ابھی مجھے بے تکلفی کے عالم میں 'تم' سے مخاطب کیا ہے؟''

''ہاں، ایسا ہے۔ کیا تمہیں برا محسوس ہوا؟''

''یہ کس قسم کا سوال ہے؟ تمہارا شکریہ۔''

'اف...... افوہ...... !تم تو ہر بات میں میرا شکریہ ہی ادا کرتے رہتے ہو۔''

''مشرق میں ہم یوں ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں...... کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ اس شخص نے تمہارا بوسہ لیا لیکن میں حسد میں مبتلا نہیں ہوا۔''

''واقعی؟''

''اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی وجہ معلوم کروں کہ میں حسد میں کیوں مبتلا نہیں ہوا۔''

ہم ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ ہماری آنکھوں میں ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔

''مجھے اپنے متعلق کچھ بتاؤ۔'' اس نے کہا۔

میں نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ اس سے پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں اسے اپنے متعلق بہت کچھ بتاؤں گا لیکن اب مجھے کوئی ایک بھی چیز یاد نہیں آ رہی تھی۔ میرے ذہن میں نئے نئے خیالات گردش کر رہے تھے۔ بالآخر میں نے یونہی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ کوئی خاص موضوع اختیار کیے بغیر میں نے اسے اپنے بچپن اور فوجی ملازمت کے متعلق بتایا۔ میں نے اسے ان کتابوں کے متعلق بھی بتایا جن کا میں مطالعہ کر چکا تھا اور اپنے ان خوابوں کے متعلق جو مجھے بہت عزیز تھے۔ میں نے اسے فاہریے کے متعلق بتایا جو میری ہمسائی تھی اور ان بدمعاشوں کا بھی ذکر کیا جن سے جنگ کے بعد میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسے اس سب کے متعلق بھی بتایا جس کا ذکر اب تک میں نے کسی سے بھی نہ کیا تھا۔ میں اپنی روح پر لدے ہر بوجھ کو اتار رہا تھا۔ اب

جبکہ مجھے پہلی مرتبہ اپنی ذات کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملا تھا، میں چاہتا تھا کہ میں کچھ بھی نہ چھپاؤں اور ہر چیز صاف صاف بتا دوں۔لیکن پوری سچائی بتانے کے جوش میں، میں نے اپنی کمزوریوں اور خامیوں پر زیادہ زور دیا۔

اب سیلابی ریلا جاری ہو گیا تھا۔میری یادیں اور جذبات، جو عرصے سے خوابیدہ تھے، تیزی سے منکشف ہو رہے تھے۔جب میں نے دیکھا کہ وہ کس قدر شوق سے یہ سب کچھ سن اور میرے چہرے کے ان تاثرات پر غور کر رہی تھی جنہیں میں الفاظ کی شکل نہیں دے سکتا تھا، میں نے اپنے متعلق مزید کھل کر بتانا شروع کر دیا۔بعض اوقات وہ میری باتوں پر صاد کرتے ہوئے سر بھی ہلا دیتی۔بعض اوقات وہ اس قدر حیران ہوئی کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔جب میں بہت پُرجوش ہو گیا تو اس نے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔جب کبھی میرے لب ولہجہ میں ملامت کی جھلک ملی، وہ ہمدردی کے عالم میں مسکرا دی۔

ایک مرحلے پر میں باتیں کرتے کرتے رک گیا کہ جیسے مجھے کسی اَن دیکھی قوت نے مجبور کیا ہو۔میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔اس وقت تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ہمارے اردگرد کی میزیں ابھی تک خالی تھیں۔میں اپنی نشست سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔''تمہیں کام سے دیر ہو جائے گی!''میں نے تقریباً چلّاتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا سامان اکٹھا کیا۔میرے ہاتھ کو پہلے سے کہیں زیادہ سختی سے بھینچتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔''تم ٹھیک کہتے ہو۔''اس نے کہا۔پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا،''ہمارے درمیان کس قدر خوب صورت گفتگو ہوئی!''

میں اس کے ساتھ پیدل اٹلانٹک تک گیا اور راستے میں ہمارے درمیان بمشکل کوئی بات چیت ہوئی۔ہم دونوں ہی اپنے اپنے خیالات میں گم تھے کہ جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ ہماری شام کیسی گزری۔جب ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے، کپکپاہٹ کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑنے لگی۔

''میری وجہ سے تم فرکوٹ لینے گھر نہیں جا سکی، تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

''تمہاری وجہ سے؟ کیا یہ سچ ہے......تمہاری وجہ سے......لیکن یہ سراسر میرا قصور

ہے...... بہر حال، کوئی بات نہیں...... آؤ ذرا تیزی سے چلیں۔''

''کیا میں تمہارا انتظار کروں اور تمہیں گھر تک چھوڑ دوں؟''

''نہیں، نہیں، اس کی ضرورت نہیں...... ہم کل ملیں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی!''

شاید وہ مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کیوں کہ اس کا تمام بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دروازے کے باہر جس کے اوپر اٹلانٹک کے حروف برقی قمقموں کی شکل میں لکھے تھے، وہ رک گئی اور اپنا ہاتھ بڑھایا کہ جیسے اس کے ذہن میں کوئی خیال سما گیا ہو۔ پھر وہ مجھے دھکیلتے ہوئے دیوار کی طرف لے گئی۔ اگرچہ وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب لے آئی تھی لیکن اس کی آنکھیں ابھی تک سڑک پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے تیز سرگوشی میں مجھ سے کہا: ''تو تم حسد نہیں کرتے؟ کیا تم واقعی مجھے اتنا پسند کرتے ہو؟''

اب اس کی متجسس نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے میری چھاتی کو کوئی دبا رہا ہو اور میرا گلا خشک ہو رہا ہو کیوں کہ اپنے احساسات کو الفاظ کی شکل دینا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ بلاشبہ، میں خوف زدہ تھا کہ ہر لفظ جو میں کہوں گا، ہر آواز جو میں نکالوں گا، ممکن ہے کہ میرے ان احساسات کو چھپا لے اور مجھے اس مسرت سے محروم کر دے۔ اب اس کے تاثرات میں قدرے خوف کی جھلک محسوس ہونے لگی۔ جیسے ہی مجھ پر مایوسی طاری ہو گئی، میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ تبھی اس کی تاثرات میں قدرے طمانیت نظر آئی۔ اس نے اپنی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بند کیں تاکہ میری باتیں زیادہ غور سے سن سکے۔ تب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور پہلی بار میرے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔ لمحے بھر بعد وہ کلب کے دروازے کے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔

میں بھاگم بھاگ واپس پنشن پہنچا۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا، اس پر غور کر سکوں۔ اس گزشتہ رات کی میری قیمتی یادوں کو کسی پناہ گاہ کی تلاش تھی، انہیں میں محفوظ کرنا چاہتا تھا کہ روزمرہ کے خیالات ان میں مخل نہ ہوں۔ جس طرح محض چند لمحوں پہلے، میں چند الفاظ کہنے کے قابل بھی نہیں تھا مبادا میری خوشی آنسوؤں میں بہ جائے، اب مجھے یہ خوف لاحق ہو چکا تھا

کہ میرے تصور کی الجھی نوعیت اس ہم آہنگی کو توڑ پھوڑ دے گی جو میں اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔

پنشن کی تاریک سیڑھیاں اب بہت خوش کُن محسوس ہوئیں جبکہ راہداری کی حبس بھری فضا بھی اب خوش گوار تھا۔

اس کے بعد سے ماریا کے ساتھ میری ملاقات روزانہ ہونے لگی۔ ہم ساتھ شہر میں آوارہ گردی کرتے۔ پہلی رات کے بعد ہم نے گزری ہوئی باتوں کو کبھی نہیں دہرایا۔ اگر ہم راستے میں گزرتے لوگوں اور مناظر کے متعلق باتیں کرتے تو صرف اس لیے کہ ان کے باعث ہمیں خیالات کو وسعت دینے اور اس کے تعین کا موقع ملتا تھا کہ ہم میں کیا چیز مشترک تھا۔ یہ قربت، ایک ہی جیسے اندازِ فکر کے باعث وجود میں آئی تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بے تکلفی، ایک خیال کے ایک پہلو کو قبول کرنے جبکہ دوسرے کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہونے کے باعث تھی۔ لیکن کیا ایسا نہیں کہ کس طرح جب دو ارواح ایک دوسرے کے خیالات کو سچ سمجھتی اور انہیں اپنا ہی بنا لیتی ہیں، تو ایک دوسرے کے قریب آجاتی ہیں؟

ہم زیادہ تر گیلریوں اور عجائب گھروں کو جاتے۔ وہ قدیم اساتذہ کے علاوہ عصر حاضر کے فن پر تبصرہ کرتی، اور ہمارے درمیان ان کی قدر و قیمت کے متعلق گرما گرم گفتگو ہوتی۔ ہم کئی دفعہ واپس نباتاتی باغ گئے اور دو دفعہ تو ہم شام کے وقت اوپیرا بھی گئے لیکن اس کے لیے اس قسم کے مقام سے ساڑھے دس بجے تک روانہ ہونا بہت ہی مشکل ہوتا اور اس لیے ہم نے جانا چھوڑ دیا۔ اور پھر ایک روز وہ کہنے لگی: ''محض اس لیے نہیں کہ میرے پاس وقت نہیں بلکہ اس لیے کہ میں اوپیرا جانا ہی نہیں چاہتی۔ اوپیرا کے بعد اٹلانٹک میں نغمہ سرائی مجھے بہت ہی فضول اور بے ہودہ محسوس ہوتی ہے۔''

اب میں محض صبح کے اوقات میں ہی فیکٹری جاتا تھا اور اب بمشکل ہی دوسروں سے پنشن میں مل پاتا۔ کبھی کبھار فاؤ میری طرف لپکتی اور کہتی: ''معلوم ہوتا ہے کہ تم پر کسی نے قبضہ جما لیا ہے!'' اس کی یہ بات سن کر میں محض مسکرا دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ تاہم، میں خاص طور پر چاہتا تھا کہ فاؤ ٹیڈ مین مجھے تلاش نہ کر سکے۔ ماریا کو اس میں کچھ غلط نظر نہ آتا ہوگا لیکن ترکی سے تعلق رکھنے کے باعث میں سمجھتا تھا کہ میں ذرا الگ تھلگ رہوں۔

لیکن پھر بھی ہمارے پاس ایک دوسرے سے چھپانے کو کچھ نہ تھا۔ اس پہلی شام کے بعد سے ہماری دوستی حدود کے اندر ہی رہی، ہم میں سے کسی نے اٹلانٹک کے سامنے اس وقفے کا ذکر بھی نہ کیا۔ شروع شروع میں تجسس ہی تھا جس باعث ہم باتیں کرتے رہتے۔ ہم ایک دوسرے میں ہمیشہ نئی چیزیں تلاش کرنے کی کوشش میں ہوتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ تجسس ہماری عادت بن گیا، اگر بوجوہم چند روز ایک دوسرے سے مل نہ پاتے، تو ہم اداس ہو جاتے۔ تاہم، جب بالآخر ہماری ملاقات ہوتی، ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑک پر ان خوش باش بچوں کی مانند پیدل چلتے جاتے جو زیادہ دیر ایک دوسرے سے جدا نہ رہ سکتے ہوں۔ میں اس سے کس قدر محبت کرتا تھا! میں نے اپنا دل اس جہان کے لیے کھول دیا تھا جو میں نے اس کے اندر دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی اور میرے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی لیکن اس نے ہمارے باہمی تعلق کو مزید آگے بڑھنے نہیں دیا۔ ایک روز، جب ہم برلن کے مضافات میں گرنیوالڈ نامی جنگل میں آوارہ گردی کر رہے تھے، اس نے اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں اور میرے کندھے سے ٹیک لگا لی۔ اس کے ہاتھ میرے شانوں پر تھے۔ وہ اپنی انگلی سے ہوا میں دائرے بنا رہی تھی۔ یکلخت میں ترنگ میں آ گیا، میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کی ہتھیلی پر بوسہ دیا۔ اس نے فوراً ہی اپنا یہ ہاتھ نرمی لیکن دانستہ انداز میں کھینچ لیا لیکن کچھ کہا بھی نہیں۔ ہم بدستور چلتے رہے۔ لیکن مجھے اس کی طرف سے واضح پیغام مل گیا تھا کہ آئندہ مجھے خود پر قابو رکھنا ہوگا۔ بعض اوقات ہم محبت کے متعلق بھی باتیں کرتے۔ یہ سن کر مجھے بہت زیادہ مایوسی ہوئی کہ وہ کس قدر آسانی کے ساتھ ایک فاصلے سے بھی اس کا جائزہ لے سکتی تھی۔ درست کہ میں نے اس کی تمام شرائط مان لی تھیں۔ لیکن بعض اوقات میں جان بوجھ کر گفتگو کا رخ اپنے اور اس کی طرف کر دیتا۔ ان مواقع پر ہم اپنی دوستی کا تجزیہ کرتے۔ میری رائے میں، محبت کسی ایک ہی کیٹگری کا نام نہیں تھا۔ محبت کی کئی اقسام تھیں، اسی طرح لوگ بہت سے مختلف طریقوں سے اپنے پیار و محبت کا اظہار کر سکتے تھے۔ حالات کے مطابق نام اور شکلیں تبدیل ہو جاتیں۔ ایک مرد اور عورت کے درمیان محبت سے انکار کر کے ہم ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے۔

بہرحال ماریا نے اپنی انگلی لہرائی اور ہنسنے لگی: ''اوہ، نہیں، میرے دوست، نہیں۔''

اس نے کہا، ''محبت تمہارے بقول محض ایک سادہ ہمدردانہ جذبہ نہیں اور نہ ہی یہ وہ جذبہ ہے جو پیدا ہوتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی بہت ہی مختلف قسم کی چیز ہے، ایک ایسی چیز جس کا تجزیہ ممکن نہیں۔ ہمیں کبھی معلوم نہیں ہوتا اور معلوم ہو بھی نہیں سکتا کہ یہ پیدا کہاں سے ہوتی ہے، یا جب یہ تحلیل ہوتی ہے تو جاتی کہاں ہے۔ جبکہ دوستی ایک مستقل جذبے کا نام ہے اور یہ باہمی افہام وتفہیم پر استوار ہوتی ہے۔ ہم بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں کہ اس نے کہاں جنم لیا اور ہمیں یہ بھی بہ خوبی علم ہوتا ہے کہ یہ کیوں ختم ہوتی ہے۔ لیکن محبت پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس لیے تمہیں اس کے متعلق سوچنا چاہیے۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہیں ہم پسند کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے بہت سے دوست ہیں۔ (میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ بہت سے معزز لوگ بھی اس فہرست میں شامل ہیں)۔ کیا اب میں ان تمام لوگوں سے محبت کروں؟''

میں اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹا: ''ہاں۔'' میں نے کہا، ''لیکن تمہیں ان تمام لوگوں سے کچھ نہ کچھ تو محبت ہو گی جن کا تم اس قدر خیال رکھتی ہو۔''

ماریا کا جواب میری توقع کے برعکس تھا۔ ''تم نے تو مجھ سے کیوں کہا تھا کہ تم حسد ورقابت محسوس نہیں کرتے؟''

بے یقینی کے عالم میں کہ کیا کہوں، میں نے کہا: ''اگر کسی شخص میں محبت کرنے کی حقیقی صلاحیت موجود ہو تو پھر وہ اپنے محبوب پر اجارہ داری نہیں جتلا سکتا اور نہ ہی اس کا محبوب اس پر اجارہ داری کا اظہار کر سکتا ہے۔ وہ اپنی محبت کا دائرہ جس قدر وسیع کرے گا، محبت اسی قدر پھیلتی جائے گی۔ محبت جب پھیلتی جائے تو ختم نہیں ہوتی۔''

''میرا خیال تھا کہ مشرقی لوگ ان چیزوں کے متعلق مختلف انداز میں سوچتے ہیں۔''

''میں ایسا ہی سوچتا ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے اس نے خلا میں اپنی نظریں جمائیں کہ جیسے کسی خیال میں گم ہو، پھر کہا: ''میرے خیال میں محبت بذاتِ خود قطعیت کی حامل ہے اور یہ ہر قسم کی منطق سے بالاتر ہے اور اسے کسی طور بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ محبت کرنا اور بات ہے۔ لیکن بدن اور روح کے ساتھ خواہش میں گھل جانا، ایک مختلف چیز ہے۔ محبت میرے نزدیک یہی ہے...... ایک ایسی خواہش جس

کے تحت انسان اپنی ہر چیز قربان کر دیتا ہے۔ ایسی خواہش جس سے مزاحمت ناممکن ہے!''

پہلے سے زیادہ اعتماد کے عالم میں جیسے میں نے اسے قائل کرلیا ہو...... میں نے کہا، ''تم جس چیز کے متعلق بات کر رہی ہو، وہ محض ایک لمحہ ہے۔ وہ لمحہ جب پہلے سے اندر موجود محبت پُراسرار قوتوں کے ذریعے اپنی تمام تر قوت ایک ہی نکتے پر مرکوز کر دیتی ہے۔ جس طرح ایک جھلتا سورج کرسکتا ہے جب اس کی شعاعیں شیشے میں سے گزرتی ہیں، الاؤ میں تبدیل ہو جاتی ہیں، محبت بھی ایسا کرسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان احساسات سے جنم لیتی ہے جو ہمارے اندر پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور یہ ہمیں اس وقت انتہائی زوردار انداز میں نشانہ بناتی ہے جب ہمیں اس کی سب سے کم توقع ہوتی ہے۔''

تاہم، یہیں پر یہ گفتگو ختم ہوگئی لیکن پھر ہم دوبارہ بھی اس موضوع پر آئے۔ میرا یہ خیال تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی سو فیصد درست نہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھل کر بات کرنے میں جس قدر ہمیں مشکل پیش آ رہی تھی، اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ ہمارے پیچھے بہت سے ایسے خیالات اور خواہشات موجود تھے جنہیں ہم نے سمجھنا شروع نہ کیا تھا۔ اگرچہ ہم بہت سے معاملات پر متفق تھے لیکن کچھ امور ایسے بھی تھے جن پر ہمارا اتفاقِ رائے نہیں تھا۔ ہم دونوں اپنی ذات کے انتہائی خفیہ راز بھی ایک دوسرے پر منکشف کرنے اور پھر باہم تو تو میں میں کرنے سے خائف نہیں تھے۔ مجموعی طور پر کچھ شعبے ایسے بھی تھے جن کو ہم نے چھیڑا نہیں کیوں کہ ہمیں ان شعبوں کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ لیکن میں نے ان کی اہمیت محسوس کر لی تھی۔

اس سے پہلے اس قسم کی قربت سے شناسانہ ہونے کے باعث میری پوری کوشش تھی کہ اس بے تکلفی کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔ اور شاید میری سب سے شدید خواہش یہی تھی کہ میں ماریا کو جزوی نہیں بلکہ بدن و روح سمیت کُلی طور پر اپنا لوں لیکن جو حاصل تھا اسے کھونے سے میں اتنا خوف زدہ تھا کہ میں اس سے ماورا دیکھنے کی ہمت ہی نہ کرسکتا تھا۔ درحقیقت، میں خدا کی مخلوق میں حسین ترین پرندے کا مشاہدہ کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے اسے خوف زدہ کر کے اڑا نہ بیٹھوں۔

لیکن ایک تاریک خیال ابھی تک مجھے خوف زدہ کیے ہوئے تھا...... کہ میری طرف سے

یہ جمود...... یہ بے حرکتی بالآخر خوفناک ہچکچاہٹ سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوگی۔ اس کے باعث وہ سب کچھ تباہ ہو سکتا تھا جو اب تک ہمارے درمیان تھا، یہاں تک کہ وہ جذبہ پتھر کی مانند سرد ہو جاتا: ہر نہ اٹھنے والا قدم ہمیں ایک دوسرے سے دور لے جاتا۔ اگرچہ یہ خدشات خاموشی میں فروزاں تھے لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے لیے پریشان کن ہو رہے تھے۔

لیکن مختلف رویہ اپنانے کی خاطر مجھے بلاشبہ، ایک اور شخص کا روپ دھارنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں دائروں میں گردش کر رہا ہوں لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ میں اس معاملے کی تہ تک کیسے پہنچوں گا۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے یا یہ معاملہ کہاں پہنچا تھا۔ اب میں مزید ہچکچاہٹ میں مبتلا نہیں تھا اور نہ ہی میں شکست تسلیم کرنے کو تیار تھا۔ اب میں صحبت سے کتراتا نہ تھا۔ شاید یہ میری شدید خواہش تھی کہ میں اپنی ذات میں ایک حقیقی شخص بن جاؤں تا کہ یہ سب کچھ دیکھ سکوں: لیکن ہمیشہ اس شرط پر کہ میں معاملے کی تہ پہنچنے کی جستجو ترک کر دوں۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ میں کسی بھی شفافیت یا گہرائی سے اس کے متعلق سوچنے کے قابل تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں واپس اس لمحے میں چلا جاؤں اور اس زمانے کو دیکھوں جب میری عمر بارہ برس تھی اور پھر نتائج پر پہنچوں۔ وقت نے مجھے ماریا کے متعلق سوچنے کے قابل کر دیا تھا۔

مجھے تب یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا مزاج ہر وقت بدلتا رہتا تھا۔ کچھ روز اس کا مزاج، بے کیف بلکہ سرد مہر رہتا جبکہ کئی روز اس میں توانائی کا جوش ابل رہا ہوتا اور وہ مجھ میں اس قدر دیوانہ وار دلچسپی کا اظہار کرتی کہ میری سانس پھولا دیتی اور حتیٰ کہ مجھے ابھارتی۔ لیکن یہ دن گزر جاتے اور ہم دونوں دوبارہ دوست بن جاتے۔ میری مانند وہ بھی ادراک کر سکتی تھی کہ ہم ایک دوراہے پر پہنچ چکے تھے اور ممکن ہے کہ ہم عمر بھر وہیں رکے رہتے۔ لیکن اگرچہ اسے مجھ میں وہ چیز نہیں ملی تھی جس کی وہ خواہش مند تھی لیکن بلاشبہ مجھ میں کچھ ایسا تھا جسے وہ اتنا پسند کرتی تھی کہ ایسی کسی بات سے اجتناب کرتی جو مجھے اس سے دور کر سکتی تھی۔

اس سے خوف زدہ ہو کر کہ آئندہ کس قسم کی صورتِ حال پیش آ سکتی تھی، مبادا یہ پریشان کن جذبات ظاہر ہو جائیں، ہم نے انہیں اپنے دلوں کے اندر ہی کہیں چھپائے رکھا۔ اس لیے ہم دوبارہ وہ عزیز دوست بن گئے جو ہمیشہ ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے، ایک دوسرے کو

خوش کرنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتے رہتے اور ہمیشہ ہی اس پر مسرور رہتے۔
پھر اچانک سب کچھ بدل گیا اور ہم قطعی نئے راستے پر گامزن ہو گئے۔ یہ دسمبر کا اواخر تھا۔ کرسمس کے لیے اس کی ماں پراگ کے مضافات میں اپنے دور کے رشتہ داروں سے ملنے چلی گئی تھی۔ ماریا بہت خوش تھی۔

''دنیا میں صنوبر کے ان درختوں سے زیادہ کوئی چیز میرے لیے صبر آزما نہیں جو موم بتیوں اور ستاروں کی روشنیوں میں چمک رہے ہوتے ہیں۔'' وہ کہنے لگی، ''اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں یہودی ہوں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھے یہ بے مقصد مذہبی رسوم مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں اور وہ لوگ مجھے کہیں زیادہ مضحکہ خیز معلوم ہوتے جو ان میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہودی مذہب کے لیے میرے پاس وقت نہیں جبکہ اس کے عجیب وغریب اور غیر ضروری اصولوں اور عقائد سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ تاہم، خالص جرمن النسل میری ماں پروٹسٹنٹ عیسائی ہے۔ وہ ان شعائر سے محض اس لیے منسلک ہے کیوں کہ وہ بوڑھی ہو چکی ہے۔ اگر وہ مجھے آج کل ملحد کہتی ہے، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ مذہبی شعائر کو بہت اہمیت دیتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ میں اس کی آخری عمر کے پُرسکون برس برباد نہ کردوں۔''

''کیا تمہیں سالِ نو میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے کہا، ''یہ باقی تمام دنوں سے کیوں کر مختلف ہے؟ کیا اسے قدرت نے کسی خاص وجہ کے باعث مختلف بنایا ہے؟ اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک اور گزرے سال کی خوشی منائی جائے؟ یہ قدرت کا کام نہیں...... بلکہ انسان کا خودساختہ تصور ہے۔ اپنی پیدائش کے دن سے جس سڑک پر ہم نے سفر شروع کیا، اس پر ہم اپنی موت تک سفر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آؤ ہم فلسفے کو الگ رکھ دیں اور نیا سال منانے کے لیے کہیں چل دیں کہ جیسے تم چاہتے ہو...... اٹلانٹک میں میرا کام آدھی رات سے پہلے ختم ہو جاتا ہے کہ وہاں ہر قسم کے پُرکشش پروگرام شروع کیے جاسکیں۔ اس لیے ہم اکٹھے باہر جا سکتے ہیں اور عین اسی طرح مخمور ہو سکتے ہیں جیسے ہر کوئی ہوتا ہے...... اچھا ہے کہ ہم بھی محض ایک لمحے کے لیے دیوانے ہو کر ہجوم میں کہیں کھو جائیں...... تم کیا کہتے ہو؟ بلاشبہ، ہم نے کبھی اکٹھے رقص نہیں کیا۔''

''نہیں، کبھی نہیں۔''

''درحقیقت مجھے رقص پسند نہیں لیکن بعض اوقات جس شخص کے ساتھ میں رقص کر رہی ہوتی ہوں، وہ پسند ہوتا ہے اور مجھے مجبوراً یہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ مجھے یہ پسند ہوگا۔''

''مجھے بھی نہیں ...... لیکن فکر مت کرو، دوستی تو نام ہی قربانیوں کا ہے۔''

نئے سال کے موقع پر ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا اور اپنی اپنی نشستوں پر اس وقت تک یونہی بیٹھے رہے جب تک ماریا کے کام پر جانے کا وقت نہیں ہو گیا۔ جب ہم اٹلانٹک پہنچے، وہ لباس تبدیل کرنے کے لیے عقبی کمرے میں چلی گئی جبکہ میں نے اپنی مخصوص میز پر قبضہ جما لیا۔ ہال جھلمل کرتی جھنڈیوں، بھڑکیلی خوب صورت جھالروں اور لالٹینوں سے سجا ہوا تھا۔ اکثر گاہک یوں محسوس ہو رہے تھے کہ جیسے پہلے ہی نشے میں دھت ہوں۔ وہ ڈانسنگ فلور پر پھسلتے ایک دوسرے کے بوسے لیتے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر عجیب سی افسردگی محسوس ہوئی۔

''تو یہ سب ہنگامہ برپا ہے۔'' میں سوچنے لگا۔ ''درحقیقت، خاص طور پر اس رات کے متعلق نئی بات کیا ہے؟ ہم وہ باتیں گھڑ لیتے ہیں جن پر ہمیں یقین کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم گھر جائیں اور آرام سے سو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جائیں اور تمام دوسرے لوگوں کی مانند گھر چلے جائیں؟ ان اور ہمارے درمیان صرف ایک ہی بڑا فرق ہوگا...... ہم ایک دوسرے کا بوسہ نہیں لیں گے...... پتا نہیں مجھے رقص کرنا آتا بھی ہے یا نہیں؟''

استنبول میں فائن آرٹس اکیڈمی کے چند مہینوں میں میرے چند دوستوں نے ان گورے روسیوں سے رقص سیکھا تھا جو اس وقت شہر میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان دوستوں سے میں نے بھی کچھ رقص سیکھا تھا۔ بلاشبہ، میں نے والز کی ایک قسم میں کچھ مہارت حاصل کر لی تھی...... لیکن مجھے کس طرح یقین آ سکتا تھا کہ میں آج رات اس رقص کا مظاہرہ کر سکوں گا جبکہ ڈیڑھ سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی؟ ''احمق۔'' میں نے خود کلامی کی، ''تم رقص میں بھی مہارت نہیں رکھتے۔''

ماریا کا کام میری توقع سے کہیں جلدی ختم ہو گیا اور پھر شور مچ گیا۔ ہر گاہک ایک کے بعد دوسری تفریح سے لطف اندوز ہونے کا شائق نظر آتا تھا۔ ماریا کے لباس بدلنے کے بعد، ہم یور پانامی ایک بڑے ریستوران کی طرف روانہ ہو گئے جو ٹرین سٹیشن کے بالمقابل واقع تھا۔ یہ اٹلانٹک کے مقابلے میں بڑا تھا اور یہاں بے تکلفی کا ماحول بھی نہیں تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، سینکڑوں جوڑے ایک بڑے ڈانسنگ فلور پر تھرک رہے تھے۔ میزوں پر ہر قسم کی رنگین بوتلیں تھیں۔ کچھ لوگ تو پہلے ہی سو چکے تھے، ان کے سر دوسروں کی گود میں یا ساکت تھے۔

عجیب طور پر ماریا پریشان نظر آنے لگی۔ میرے بازو پر مکہ مارتے ہوئے وہ کہنے لگی: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم نے یہاں آ کر محض بیٹھ جاؤ اور کھوئے کھوئے سے رہو گے تو میں کسی اور نوجوان کو اپنے ہمراہ لے آتی۔''

میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کیسے اس نے خوش ذائقہ مشروب کے کئی گلاس آن کی آن میں چڑھا لیے۔ وہ مجھ سے بھی یہی کرنے کا اصرار کرنے لگی۔

آدھی رات کے بعد یہ جگہ واقعی ہنگامہ خیز ہو گئی تھی۔ رقص کے ادوار کے ساتھ موسیقی کی لہروں کے درمیان ہلکی ہلکی چیخوں اور ہنسی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جبکہ جوڑے ڈانسنگ فلور پر پھسل رہے تھے۔ اس وقت یہاں ایسا شاندار اور خوش گوار جشن کا سا سماں تھا، ایسا ملک جو اب جنگ کا شکار نہ تھا۔ لیکن انہیں دیکھ کر میرے دل پر اداسی اور افسردگی چھا گئی، یہ لاغر مخلوق جن کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور آنکھوں میں جھلملاہٹ نظر آ رہی تھی، محسوس یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی خوفناک اور مہیب خواب کے زیر اثر ہوں! یہ نوجوان اعتدال کی ہر حد عبور کر چکے تھے۔ لڑکیاں جو سمجھتی تھیں کہ معاشرے کے خلاف بغاوت کر رہی ہیں، جنسی خواہش کی اسیر بن چکی تھیں۔

ایک اور گلاس میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے ماریا نے سرگوشی کی: ''راعف، راعف۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا...... کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں مایوسی میں غرق ہونے سے بچنے کی کس قدر کوشش کر رہی ہوں؟ اس بات کو جانے دو۔ بہتر یہی ہے کہ محض آج رات کے لیے ہم اپنے خول سے باہر نکل آئیں، تصور کرو کہ ہم اس وقت وہ نہیں جو ہم ہیں۔ ہم کوئی دوسرے دو لوگ ہیں جو اس ہجوم میں گم ہو چکے ہیں۔ اپنے اردگرد بغور نظر ڈالو...... کیا ان میں سے کوئی بھی حقیقتاً وہی کچھ نظر آتا

چاہتا ہے جو وہ ہے؟ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ہم کیا نہیں: ہم دوسروں سے مختلف نہیں۔ سب یوں ظاہر کر رہے ہیں کہ صرف وہی نفیس احساسات وخیالات کے مالک ہیں۔ یہ وقت ہے پینے پلانے اور خوشی منانے کا!''

میں بہ خوبی دیکھ سکتا تھا کہ وہ مخمور ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ میرے مقابل بیٹھی تھی لیکن اب ماریا میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی اور اپنا بازو میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور میں خود کو کسی ایسے پرندے کی مانند محسوس کرنے لگا جو جال میں پھنس چکا ہو۔ میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ اسے یہ ادراک ہو چکا تھا کہ میں پریشان ہوں۔ لیکن سچ سے دور کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی خوشی کو بہت سنجیدگی سے لے رہا تھا: میں اس قدر خوش تھا کہ مسکرا بھی نہ سکتا تھا۔

ایک دفعہ پھر رقص کا دَور شروع ہوا۔ اس کی طرف جھکتے ہوئے میں نے سرگوشی کی: ''ہم بھی رقص کریں لیکن واقعی مجھے رقص نہیں آتا......''

یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اس نے میرے فقرے کا دوسرا نصف حصہ نہیں سنا، وہ یکدم اچھل کر کھڑی ہو گئی: ''آ ؤ رقص کریں!''

ہم بھی لہراتے ہوئے ہجوم کے درمیان پہنچ گئے۔ یہ کسی طرح بھی رقص معلوم نہیں ہوتا تھا: ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ ان بدنوں کے دباؤ سے اِدھر سے اُدھر ہوتے جائیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی شاکی نہیں تھا۔ ماریا کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار اس کی سیاہ اور کھوئی ہوئی آنکھوں میں کوئی چیز چمکتی نظر آتی، ایک ایسی چیز چمکتی نظر آتی جو میری سمجھ سے باہر تھی اور پھر اس کے گرم بدن سے اٹھتی ہوئی مدھم لیکن نشہ آور خوشبو نے مجھے ہر احتیاط سے ماورا کر دیا۔ اس موقع پر میں یہی سمجھ سکتا تھا کہ ماریا کے لیے مجھ سے اس قدر قریب ہونا معانی رکھتا تھا۔

''ماریا۔'' میں نے سرگوشی کی، ''کس طرح کوئی کسی دوسرے شخص کو اس قدر خوش کر سکتا ہے؟ یہ مقصد حاصل کرنے کی خاطر ہمیں کیسی کی حیرت انگیز قوتیں چاہئیں جو ہمارے اندر گہرائی میں پوشیدہ ہوں۔''

ایک بار پھر میں نے اس کی آنکھوں میں روشنی کی ایک لہر ابھرتی دیکھی لیکن کافی دیر تک مجھ پر نگاہیں جمائے رکھنے کے بعد وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ اس وقت اس کی آنکھیں خالی

اور دھندلی نظر آ رہی تھیں: ''آؤ، ہم بیٹھ جائیں۔کیا بے ہنگم ہجوم ہے! وہ میری طرف ہی لپکتے آ رہے ہیں۔''

واپس میز پر آتے ہی اس نے ایک کے بعد دوسرا گلاس چڑھا لیا۔ پھر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی: ''اب میں واپس جا رہی ہوں۔'' اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میں نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا۔اپنی تمام تر مزاحمت کے باوجود میں نے بھی بہت زیادہ پی لی تھی۔ میں اس قدر مدہوش نہیں ہوا تھا لیکن مجھے بہت زیادہ غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے سر میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ پینتالیس منٹ گزر گئے لیکن وہ نہ آئی۔ مجھے فکر ہونے لگی، میں اٹھا اور غسل خانوں میں اسے تلاش کیا کہ ممکن ہے کہ وہ کہیں گری پڑی ہو۔اس وقت خواتین آئینوں کے سامنے کھڑی اپنا میک اَپ درست کر رہی یا اپنے ڈھیلے لباس کو درست کر رہی تھیں۔ مجھے ماریا کہیں بھی نہ ملی۔ مین نے ہال کے کونوں میں موجود خواتین میں اسے تلاش کیا اور ان خواتین پر بھی نظر ڈالی جو صوفوں پر ٹیڑھی میڑھی ہو کر گہری نیندیں تھیں۔کرب کی شدید لہر کے زیر اثر میں ایک سے دوسرے کمرے میں گھومنے لگا، میزوں پر جھانکنے لگا اور اس کی تلاش کی خاطر ہجوم میں راستہ بناتا رہا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں پہلے زمینی منزل پر گیا اور اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں لیکن اس کا کہیں بھی نام ونشان نہ تھا۔

پھر مجھے گھومتے دروازوں کے دھندلے شیشوں میں اس کی ایک جھلک نظر آئی، وہ کسی مُردے کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ تیزی سے باہر بھاگتے ہوئے میں نے بلند آواز سے اسے پکارا۔ وہ ایک درخت کی جانب بڑھ رہی تھی، اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس کا چہرہ تاریکی میں تھا۔اس وقت اس کے بدن پر محض ایک پتلا سا اونی لباس تھا۔برف کے گالے اس کے بالوں اور گردن پر گر رہے تھے۔اس نے میری آواز سنی، مڑی، مسکرائی اور پوچھنے لگی: ''تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''تم کہاں چلی گئی تھیں؟'' میں چلّایا، ''تم کیا کر رہی ہو؟ کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟''

انگلی اپنے ہونٹوں تک لاتے ہوئے، اس نے کہا: ''شش، شش۔ میں تو تازہ ہوا کھانے اور سکون کی خاطر باہر آئی تھی۔آؤ، چلیں۔''

میں بلا پس و پیش اسے کھینچ کر اندر لایا اور ایک تپائی پر اسے بٹھا دیا۔ پھر میں رقم کی ادائیگی کرنے کے علاوہ اپنا کوٹ اور اس کا فرکوٹ لانے کے لیے بالائی منزل گیا۔ اسی کے ساتھ ہم چل دیئے، ہمارے قدم برف میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔

میرے بازو سے چپکتے ہوئے وہ چلتے رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نزدیکی سڑکوں پر نشے میں مخمور جوڑے اِدھر اُدھر نظر آ رہے تھے۔ پختہ چوڑی سڑکوں پر مختصر لباس میں ملبوس خواتین کے ہجوم اس طرح قہقہے لگا اور گا رہے تھے کہ جیسے وہ آدھی رات کے دو یا تین گھنٹے بعد موسم بہار کے تفریحی سفر پر روانہ ہوں گے۔

نشے میں دھت اس ہجوم کے ساتھ مار یا مجھے تیزی سے آگے دھکیل رہی تھی۔ وہ لوگ جو اسے پکار رہے تھے یا جنہوں نے اس سے ہم آغوش ہونے کی کوشش کی تھی، ان کی طرف اس نے ایک عاجلانہ مسکراہٹ اچھالی اور نہایت مہارت سے وہ مجھے دھکیلتے ہوئے آگے نکل گئی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، اس وقت مجھے یہ ادراک ہو گیا تھا کہ میری یہ سوچ غلط تھی کہ وہ نشے میں اس قدر مدہوش تھی کہ اپنے پیروں پر بھی کھڑے ہونے سے قاصر تھی۔

کچھ دیر بعد ہم ان سڑکوں پر پہنچ گئے جو بہت ہی پُرسکون تھیں اور ہم نے اپنی رفتار سست کر لی۔ لیکن اس کی سانس ابھی تک بحال نہ ہوئی تھی۔ ایک گہری آہ بھرتے ہوئے وہ میری طرف مڑی اور کہنے لگی: ''اب بتاؤ؟ جو کچھ آج رات پیش آیا، کیا تم اس سے خوش ہو؟ کیا تم نے اچھا وقت گزارا؟ اوہ، میرا وقت تو بہت...... بہت ہی شاندار گزرا......''

اس کی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی اور پھر اسے کھانسی آنے لگی۔ اس کی چھاتی اس طرح کھڑکھڑا رہی تھی کہ جیسے اس کا دم گھٹنے والا ہو لیکن وہ ابھی تک میرے بازو سے چپکی ہوئی تھی۔ جب اس کا سانس اس کے قابو میں آیا تو میں کہنے لگا: ''یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا میں نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا؟ تمہیں ٹھنڈ لگ گئی ہے۔''

اس نے ایک مسکراہٹ سے جواب دیا: ''اوہ، لیکن میں نے بہت لطف اٹھایا ہے!''

اب مجھے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ رو نہ دے۔ میں چاہتا تھا کہ اسے گھر لے جاؤں اور جلد از جلد بستر پر سلا دوں۔

جب ہم اس کی رہائشی عمارت کے قریب پہنچے، وہ لڑکھڑانے لگی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کی توانائی ختم ہو چکی اور ساتھ ہی اس کی قوتِ ارادی بھی تحلیل ہو چکی ہو۔ سرد ہوا نے میرے بدن میں بھی کپکپاہٹ دوڑا دی تھی۔ اب میں اس کی کمر سے اسے سہارا دیے ہوئے تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اس کے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔ ایک سڑک عبور کرتے ہوئے ہم برف میں تقریباً لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ اب وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی لیکن میں اسے چپ نہ کروا سکا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ وہ کوئی نغمہ گنگنا رہی تھی لیکن جب میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے تو میں نے اپنے کان لگائے: ''ہاں...... یہی وجہ کہ میں......'' اس نے کہا، ''راعف...... اوہ...... پیارے راعف...... میں تو ایسی ہی ہوں...... کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا؟ ایک روز میں ایک طرح ہوتی ہوں اور دوسرے روز دوسری طرح...... لیکن اس بارے میں اداس ہونے کی ضرورت نہیں...... تم بہت ہی اچھے لڑکے ہو...... اور اس میں مجھے کوئی شک نہیں۔''

اس موقع پر، اس کی ہچکی بندھ گئی لیکن جلد ہی وہ سنبھل گئی: ''نہیں، نہیں، اس پر افسردہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں......''

نصف گھنٹے بعد ہم اس کے دروازے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ سیڑھیوں کی دیوار سے ٹیک لگا کر وہ میرا انتظار کرنے لگی۔

''تمہاری چابیاں کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''راعف، مجھ سے ناراض مت ہو...... غصہ مت کرو...... چابی...... میری جیب میں ہے!''

اپنے فرکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے چابیوں کا گچھا نکالا جس میں تین چابیاں مجھے نظر آئیں۔

میں نے دروازہ کھولا۔ جیسے ہی میں اسے سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دینے کے لیے واپس مڑا، وہ میرے پاس سے گزرتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

''احتیاط سے؟'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

مشکل سے سانس لیتے ہوئے اس نے کہا: ''نہیں، اب میں خود اوپر جا سکتی ہوں۔''

چوں کہ اس کی چابیاں میرے پاس تھیں، میں اس کے پیچھے گیا۔ زینہ چڑھنے کے بعد تاریکی میں مجھے اس کی پکارنے کی آواز آئی: ''میں یہاں ہوں...... دروازہ کھول دو۔''

دروازہ ٹٹولتے ہوئے میں نے اسے کھولا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی اندر داخل ہوئے اور اس نے روشنیاں جلا دیں۔ فرنیچر پرانا تھا کہ لیکن اسے بہت احتیاط سے استعمال کیا گیا تھا۔ ایک طرف شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک خوب صورت پلنگ رکھا تھا۔

اس وقت میں کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اپنا فرکوٹ اچھالتے ہوئے اس نے مجھے کرسی پر بیٹھے کا اشارہ کیا: ''بیٹھ جاؤ۔''

پلنگ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنے جوتے اور موزے اتارے۔ اور پھر بلاتاخیر اس نے اپنا لباس اپنے سر سے کھینچ کر اتارا، اسے کرسی پر پھینکا اور لحاف میں گھس گئی۔

اٹھتے ہوئے میں نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے میرے سراپے پر نظر دوڑائی کہ جیسے وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہی ہو، اس کے چہرے پر ایک نشیلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ جب میں نے دوبارہ اپنی نگاہیں اٹھائیں تو دیکھا کہ وہ بیٹھی مجھے ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی اور ان میں سے تجسس جھلک رہا تھا۔ وہ اپنی پلکیں یوں جھپکا رہی تھی کہ جیسے ابھی بیدار ہوئی ہو۔ سفید لحاف ایک طرف کھسک گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا دایاں بازو اور کندھا نظر آنے لگا۔ وہ بھی اس کے چہرے کی مانند زرد تھے۔ پھر اس نے اپنی بائیں کہنی تکیے پر جما لی۔

''تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

میرا بازو کھینچتے ہوئے وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ میری طرف بڑھی، میرے ہاتھ کھول کر اپنا چہرہ ان پر جما دیا۔

''اوہ، راعف۔ تم بھی اسی طرح ہو سکتے ہو؟ تمہیں پورا حق حاصل ہے...... لیکن میں کیا کر سکتی ہوں؟ اگر صرف تمہیں ہی علم ہوتا...... اگر صرف...... لیکن ہم نے بہت خوشگوار وقت گزارا، ہے ناں؟...... نہیں، نہیں، مجھے معلوم ہے! اپنے ہاتھ پیچھے مت کرو...... میں نے تمہیں ایسا کبھی نہیں

دیکھا......تم کتنے سنجیدہ ہو سکتے ہو! لیکن کیوں؟''

میں نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اب وہ بستر پر میری طرف جھک رہی تھی، میرا چہرہ اس نے اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ ''میری طرف دیکھو۔'' اس نے کہا، '' ویسا نہیں جو تم سوچ رہے ہو...... میں تم پر یہ ثابت کر سکتی ہوں...... میں خود کو تم پر ثابت کر سکتی ہوں...... وہاں کیوں بیٹھے ہو؟ تمہیں ابھی تک مجھ پر یقین نہیں؟ تم مجھ پر بھروسا نہیں کرتے؟''

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی فریب کن خیال کو اپنے تصور میں لانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ جب میں نے ان عریاں شانوں کو کپکپاتے دیکھا، میں نے لحاف کھینچ کر اس پر دے دیا اور تھامے رکھا دوبارہ نہ کھسک جائے۔

اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھولیں اور حیرانی کے عالم میں مسکرائی۔ ''تو یوں ہے......تم بھی مسکرا رہے ہو، کیا ایسا نہیں؟'' مزید کچھ کہنے کی قدرت نہ رکھتے ہوئے اس نے ایک گوشے کی طرف اپنی نظریں جما لیں۔

اس کے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ روشنی، جو اس کے چہرے کی ایک جانب کو روشن کر رہی تھی، اس کی پلکوں کو بھی روشن کر رہی تھی جس باعث اس کی ناک پر سایہ سا پڑنے لگا۔ اس کے نچلے ہونٹ پر خفیف سا لرزہ طاری ہوا۔ اس لمحے وہ اپنی تصویر سے بھی کہیں زیادہ حسین معلوم ہونے لگی، میڈونا آف ہارپیز سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ لحاف کو اپنے ہاتھ سے تھامے ہوئے میں نے اسے اپنے نزدیک کھینچ لیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کا بدن لرز رہا تھا، اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''بلاشبہ...... بلاشبہ......'' وہ کہنے لگی، ''بلاشبہ، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور بہت محبت کرتی ہوں......کیا اس کے علاوہ بھی کچھ صورت ہو سکتی تھی؟ مجھے تم سے محبت کرنی چاہیے...... میں واقعی تم سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن تم حیران کیوں ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ اس کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی تھی؟ مجھے معلوم ہے کہ تم کس قدر مجھ سے محبت کرتے ہو......اور بلاشبہ، میں بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں......''

اس نے مجھے مزید اپنی طرف کھینچا اور دیوانہ وار میرے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔

میں اگلی صبح گہرے اور متوازن سانس لیتے ہوئے بیدار ہوا۔ اس کا سر اس کے بازو پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کے بال سفید تکیے پر بکھرے ہوئے تھے، اس کے ہونٹ خفیف سے کھلے ہوئے تھے جو اس کی کپکپاتی سانسوں کے ساتھ ہل رہے تھے۔

واپس تکیے پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے میں چھت کو دیکھنے اور انتظار کرنے لگا۔ اب مجھے صبر کا یارا نہ تھا۔ مجھے یہ جاننے کی حسرت تھی کہ وہ بیدار ہو کر کن نظروں سے مجھے دیکھے گی اور کیا کہے گی لیکن بوجوہ مجھے اس لمحے سے بھی خوف آ رہا تھا۔ اپنی آنکھیں کھولتے ہی میرا ذہنی سکون ہوا ہو گیا تھا اور اس کی وجہ مجھے قطعی معلوم نہ تھی۔ میں سزا کے منتظر کسی مجرم کی مانند کیوں لرز رہا تھا؟ اس سے زیادہ میں اس سے کیا چاہ سکتا تھا؟ میں اس سے اس سے زیادہ کیا توقع رکھتا؟ کیا میرے دل کی تمام خواہشیں پوری نہیں ہو گئی تھیں؟

اس وقت میں اپنے دل کو کس طرح خالی محسوس کرنے لگا! لیکن میرا دل بوجھل بھی بہت ہو رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ خلا ضرور تھا لیکن کیا؟ میں خود کو اس شخص کی طرح خالی الذہن محسوس کرنے لگا کہ جو سڑک کے درمیان رک جاتا اور یاد کرنے لگتا ہے کہ وہ کون سی چیز گھر بھول آیا ہے لیکن اسے کچھ یاد نہیں آتا اور پھر اپنے ذہن اور اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے وہ بالآخر اپنی کوشش ترک کر دیتا ہے اور ہچکچاتے ہوئے اسی راستے پر دوبارہ گامزن ہو جاتا ہے جبکہ شکوک کے ناگ ابھی تک اسے ڈس رہے ہوتے ہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میں اب مزید ماریا کی سانس کی ہم آہنگ آمد و رفت نہیں سن سکتا۔ اپنا سر اٹھاتے ہوئے میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو بے حس و حرکت دور کہیں خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ اس کے بال ابھی تک اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اگرچہ اسے علم تھا کہ میری نظریں اس پر مرکوز تھیں لیکن وہ پھر بھی دور کہیں کسی اَن دیکھے نقطے پر بدستور اپنی نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ میں جان گیا کہ وہ کچھ دیر پہلے سے بیدار تھی، جب کسی اَن دیکھے شکنجے نے میری چھاتی کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا اور میرے دل میں موجود

خوف میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

میں نے جس قدر اپنے بے معنی خدشات اور غیر ضروری، بے بنیاد پریشانیوں کے بارے میں سوچا، اسی قدر میں اپنی قنوطیت اور قابل رحم وجدان سے اسے تاریک کرتا گیا جو میری زندگی کا روشن ترین دن تھا اور اتنا ہی میں مایوس ہوتا گیا۔

''کیا تم بیدار ہو چکے ہو؟'' اس نے سر کو موڑے بغیر مجھ سے پوچھا۔

''ہاں...... کیا تم کافی دیر پہلے جاگ گئی تھیں؟''

''میں ابھی جاگی ہوں۔''

میں نے اس کی آواز میں اپنے لیے حوصلہ افزائی محسوس کی جو عرصے سے میرے لیے شیریں ترین آواز تھی۔ میں نے ایک پرانے دوست کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس آواز کو سننے کی خاطر جو خوشگوار یاد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لیکن جو سکون اس کی وجہ سے مجھے حاصل ہوا، محض عارضی تھا۔ اس نے مجھے رسمی 'آپ' کہہ کر مخاطب کیا تھا جبکہ ہم نے حال ہی میں رسمی اور غیر رسمی میں فرق کو مٹانا شروع کر دیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اکٹھے یہ رات گزارنے کے بعد اس کی طرف سے میرے لیے باتکلف 'آپ' کا لفظ استعمال پر میں کیا سمجھوں؟

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔

وہ میری جانب مڑی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ لیکن یہ وہ گرم جوش اور مخلص مسکراہٹ نہ تھی جس سے میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ یہ مسکراہٹ، اس قسم کی تھی جس سے وہ اٹلانٹک میں گاہکوں کو نوازتی تھی۔

''کیا تم اٹھ رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں!'' میں نے جواب دیا، ''اور تم؟''

''میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی...... میری طبیعت کچھ اچھی نہیں...... مجھے کچھ نقاہت سی محسوس ہو رہی ہے...... شاید میں نے زیادہ پی لی تھی...... میری کمر میں بھی درد ہے......''

''معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ رات تمہیں ٹھنڈ لگ گئی ہے! تم نے اس حالت میں بغیر کچھ گرم پہنے باہر جاتے کچھ نہیں سوچا؟''

اس نے کندھے اچکائے اور رخ موڑ لیا۔

میں اٹھا، منہ دھویا، لباس پہنا جبکہ اس دوران مجھے اس کی نگاہیں خود پر مرکوز محسوس ہوتی رہی تھیں۔

کمرے میں بے چینی کا عالم تھا۔ میں فضا سے یہ کشیدگی ختم کرنا چاہتا تھا: ''ہم دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا...... ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہم کسی بوڑھے شادی شدہ جوڑے کی مانند پہلے ہی ایک دوسرے سے بیزار ہو چکے ہیں؟''

اس نے نہ سمجھ نظروں سے دیکھا۔ اس باعث میں مزید پریشان ہو گیا، اس لیے میں نے مزید کچھ نہ کہا۔ لیکن پھر میں اس کے بستر کی طرف گیا: میں اسے پیار کرنا چاہتا تھا، میں چاہتا تھا کہ میں اپنے درمیان برف کی دیوار گرا دوں، کہیں یہ مزید بڑھ جائے۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی اور اپنی ٹانگیں بستر سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ اپنے کندھوں پر اس نے پتلی سی چادر ڈال لی۔ اس دوران، مجھ پر اس کی نظریں جمی رہیں کہ جیسے وہ میرا چہرہ پڑھ رہی ہو۔ اسے کوئی چیز پریشان کر رہی تھی اور وہ کچھ کہنے سے ہچکچا رہی تھی۔ بالآخر اس نے بولنا شروع کیا تو حسب معمول اس کا لب ولہجہ بہت ہی پُرسکون تھا: ''تم پریشان کیوں ہو؟''

اور پھر، پہلی بار میں سے اس کا زرد چہرہ گلابی ہوتے دیکھا۔ اس کی چھاتی پر لرزہ طاری تھا۔ اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا: ''تم اس سے زیادہ کیا چاہتے ہو؟ کیا مزید کوئی چیز ہے جو تمہیں مجھ سے مطلوب ہو سکتی تھی؟...... لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں۔ میں اس سے بھی کہیں زیادہ چاہتی ہوں، بہت زیادہ...... لیکن یہ ابھی تک میرے بس میں نہیں۔ میں نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے لیکن بے سود۔ اب کے بعد تم خوش ہو سکتے ہو لیکن میرا کیا ہو گا؟''

اس کا سر اس کی چھاتی سے جا لگا جبکہ اس کے بازو بے جان ہو کر پہلو کے ساتھ لگ گئے۔ اس کے پیر قالین کو چھو رہے تھے۔ اس کے پاؤں کا انگوٹھا اوپر اور باقی انگلیاں نیچے کی طرف مڑ گئیں۔

میں نے کرسی اپنی طرف کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ میری آواز میں کسی ایسے شخص کی سی کپکپاہٹ پیدا ہو گئی جو اپنی سب سے زیادہ قیمتی متاع اور

اپنی زندگی کے مفہوم سے محروم ہونے کو ہو۔

''ماریا۔''میں نے کہا،''ماریا۔میری فرکوٹ والی میڈونا۔یہ اچانک کیا ہو گیا؟ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔کیا میں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا؟ تم یہ سب کچھ ایک ایسے وقت کیوں کہہ رہی ہو جب ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہیے؟''

اپنا سر ہلاتے ہوئے وہ کہنے لگی:''نہیں، میرے دوست، نہیں! ہم پہلے سے کہیں زیادہ ایک دوسرے سے دور ہیں کیوں کہ میں نے ہر امید کا دامن چھوڑ دیا ہے۔اب اختتام ہے...... میں نے خود کو بتایا تھا کہ ایک نہ ایک روز یہ وقت ضرور آئے گا...... میں محض یہ سوچ رہی تھی کہ اب اسی چیز کی کمی تھی۔لیکن نہیں، مجھے اپنے اندر یہی خالی پن ابھی تک محسوس ہوتا ہے...... بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ۔اب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تمہارا قصور نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہی نہیں۔لیکن میں خوب جانتی ہوں کہ ہماری اس دنیا کو کیا درکار ہے؛ کہ یہ اعلان کرنے کے بعد کہ مجھے تم سے محبت ہے، میں تمہاری محبت میں گرفتار ہونے میں ناکام رہی ہوں۔ باوجود اس کے کہ میں اپنی تمام امیدوں سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں اور کسی دوسرے سے کبھی محبت بھی نہیں کر سکتی......لیکن یہ میرے بس میں نہیں۔اس لیے، میں تو بس ایسی ہی ہوں۔ میں مجبور ہوں کہ میں حالات کو جوں کا توں قبول کر لوں......اوہ، کس طرح میں یہ خواہش کر سکتی ہوں...... کس طرح میں یہ خواہش کر سکتی ہوں کہ کاش ایسا نہ ہوتا......راعف...... میرے شفیق دوست...... برائے کرم یقین کرو کہ مجھے تم سے بھی زیادہ تمنا ہے......اور شاید تم سے بہت زیادہ ہے...... کہ ایسی صورتِ حال نہ ہوتی۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟ اس وقت میرا ذہن خالی ہے اور مجھے مشروب کا تلخ ذائقہ اپنے حلق میں ابھی تک محسوس ہو رہا ہے جبکہ میری کمر میں بھی درد ہے جو آہستہ آہستہ شدید ہوتا جا رہا ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش ہو گئی۔اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کا پیارا چہرہ نرم پڑ گیا تھا۔ایک ایسی آواز میں جو بہت ہی شیریں تھی کہ جیسے بچپن کی پریوں کی کہانی بیان کر رہی ہو، وہ کہنے لگی:''گزشتہ رات، خاص طور پر جب ہم یہاں آئے تھے، اوہ، جن حالات کی مجھے توقع تھی...... میں نے خواب میں جادو کی ایک چھڑی دیکھی جو مجھے پوری طرح بدل سکتی تھی، مجھے

ایک نیا دل دے سکتی تھی، ایک ایسا نیا دل دے سکتی تھی جو کسی ننھی لڑکی جیسی معصومیت سے لبریز ہوتا جو تمام مخلوق کو اپنا سکتا ہو، تا کہ صبح کو میں ایک نئی دنیا میں بیدار ہوتی۔ لیکن یہ ایک دوسرا ملک ہے...... یہاں کے آسمان ابر آلود ہیں...... میرا کمرا سرد ہے...... مجھے اپنے اردگرد کی ہر چیز سے اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان موجود انسیت کے باوجود، تم مجھ سے بہت دور ہو، کسی دوسرے بدن میں کوئی اور شخص ہو...... میں بہت تھک چکی ہوں، میرے سر میں درد ہے......"

وہ دوبارہ بستر پر گر گئی اور پشت کے بل لیٹ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور اپنی بات دوبارہ شروع کی: "لہٰذا میرے خیال میں اس سے مراد یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے اتنا قریب ہوتے ہیں اور پھر جدا ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ کس قدر میں نہیں چاہتی کہ ہماری بے تکلفی محدود ہو یا ختم ہو جائے۔ مجھے واقعتاً یہ بات افسردہ کرتی ہے کہ میری امیدیں کس قدر کھوکھلی ہو چکی ہیں...... اب ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی کوئی تک نہیں...... اب ہم پہلے کی طرح مزید کھل کر بات نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس بے تکلفی کو قربان کر دیا اور کس لیے اور کیوں؟ کسی کے لیے بھی نہیں! ایسی چیز کو اپنا بنانے کی کوشش میں جس کا کبھی وجود ہی نہیں تھا، ہم ایک ایسی چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے جو ہمارے پاس پہلے موجود تھی...... کیا سب کچھ ختم ہو چکا ہے؟ میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی بچہ نہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ ہم کچھ وقت ایک دوسرے سے الگ صرف کریں، کچھ دیر آرام کریں۔ اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ رہیں جب تک دوبارہ ایک دوسرے ملنے کی شدید خواہش ہم پر غلبہ نہ پا لے۔ بہت ہو گیا! راعف، وقت آنے پر میں تمہیں بلاؤں گی۔ شاید ہم دوبارہ دوست بن جائیں اور عقلمندی کا تقاضا یہی ہو۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ زیادہ توقع نہیں، یا ہم سوچ سکتے ہیں کہ ہم اس قدر ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں...... لیکن اب وقت ہے کہ تم چلے جاؤ...... اب میں واقعی تنہائی چاہتی ہوں......"

اس نے اپنی آنکھوں سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ میری طرف تقریباً ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کی انگلیوں کی پوروں کو تھام لیا اور کہا: "الوداع......"

''نہیں، نہیں، ایسے نہیں......تم مجھ سے ناراض ہو......میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟'' وہ ودی۔

پُرسکون رہنے کے لیے اپنی تمام تر قوت مجتمع کرتے ہوئے، میں نے کہا: ''میں ناراض نہیں، محض افسردہ ہوں۔''

''کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں بھی افسردہ ہوں؟ کیا تم دیکھ نہیں سکتے؟ ہمیں اس طرح جدا نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں آؤ۔''

میرا سرا اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اس نے میرے بال سہلائے۔ اس نے اپنا رخسار میرے رخسار پر رکھ دیا۔

''میرے لیے ایک دفعہ مسکراؤ اور پھر چلے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

میں مسکرایا اور پھر جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔ میرا چہرہ میرے ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا۔

باہر نکل کر میں سڑکوں پر بلا مقصد گھومنے لگا۔ باہر کوئی متنفس نہیں تھا اور اکثر دکانیں ابھی تک بند تھیں۔ میں شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹرام اور بسیں تیزی سے گزرتی جا رہی تھیں۔ میں چلتا جا رہا تھا......میں پختہ سڑک پر چلتا اور ان گھروں کو دیکھتا جا رہا تھا جن کے مرکزی دروازے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے......میں چلتا گیا......میں نے اپنی جیکٹ کھول لی کیوں کہ مجھے پسینہ آنے لگا تھا۔ میں شہر کے آخر تک پہنچ گیا لیکن پھر بھی بدستور چلتا گیا۔ راستے میں ریلوے کے پُل بھی آئے جبکہ ایک درجن سے زائد نہریں بھی......میں رکا نہیں، چلتا رہا۔ مجھے چلتے ہوئے گھنٹوں ہو گئے۔ میں خالی الذہنی کے عالم میں بدستور چلا جا رہا تھا، میری آنکھیں سردی کے باعث جھپکنے لگی تھیں، اس لیے میں نے اپنی رفتار تیز کر لی اور اب میں تقریباً دوڑ رہا تھا۔ میری دونوں اطراف صنوبر کے جنگلات تھے۔ کبھی برف کا کوئی گالا شاخ سے گر پڑتا۔ سائیکل سوار میرے پاس سے گزرتے گئے جبکہ دور کہیں مجھے ریل گاڑی کی سیٹی بھی سنائی دی جو زمین میں لرزہ پیدا کر رہی تھی۔ میں چلتا گیا......اور پھر میں نے اپنی دائیں جانب ایک بڑی جھیل دیکھی جو سکیٹرز سے بھری پڑی تھی۔ جنگلوں کی طرف رخ کرتے ہوئے میں اس طرف روانہ ہو گیا۔

درختوں کے بیچوں بیچ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں تھیں جو سکیٹنگ کرنے والوں کے باعث وجود میں آئی تھیں۔ درختوں ایک جھنڈ میں جس کے اردگرد حفاظت کی غرض سے تاروں کی باڑ لگائی گئی تھی، برف پوش صنوبر کے ننھے پودے سفید ٹوپیوں میں ملبوس بچوں کی مانند کانپ رہے تھے۔ فاصلے پر مجھے دومنزلہ سرائے نظر آئی۔ جھیل کی طرف مڑتے ہوئے مجھے مختصر سکرٹوں میں ملبوس لڑکیاں جبکہ کلپ لگی پتلونوں میں ملبوس نوجوان بھی نظر آئے جو پہلو بہ پہلو برف پر پھسل رہے تھے۔ وہ گھومنے کے لیے ایک پاؤں اٹھاتے، پھر ان کی رفتار تیز ہو جاتی اور پھر وہ دور کہیں غائب ہو جاتے۔ لڑکیوں کے رنگین سکارف ہوا میں پھڑ پھڑا اور اسی طرح لڑکوں کی سنہری ڈاڑھیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں جبکہ وہ کبھی اِدھر جاتے اور کبھی وہ اُدھر جاتے اور ہر قدم کے ساتھ لگتا کہ ان کی قامت بدل جاتی تھی، ایک ساتھ حرکت کرتے ہوئے۔

میری آنکھیں، میری کان، سب اس طرف متوجہ تھے۔ گھٹنوں تک برف میں دھنسے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے جھیل کی طرف جانے کی کوشش میں مجھے راستے کی تمام چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ سرائے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں جھیل کے پار درختوں کی جانب بڑھ گیا۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ ایک بار پہلے بھی میں یہاں آیا تھا لیکن مجھے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب اور نہ ہی مجھے درست معلوم ہو سکا کہ میں کہاں تھا۔ سرائے سے چند سو میٹر کے فاصلے پر موجود پہاڑ پر چند درخت تھے۔ میں ایک دفعہ پھر برف پر پھسلنے والوں کو دیکھنے لگا۔

مجھے اب چلتے ہوئے بلاشبہ، گھنٹوں ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ احساس نہیں رہا تھا کہ میں کب اور کیوں موڑ مڑتا اور کیا وجہ تھی کہ میں اب تک واپس کیوں نہیں جا سکا تھا۔ میرے سر میں ہونے والی جلن اب ختم ہو چکی تھی جبکہ میری ناک میں ہونے والی خارش بھی تحلیل ہو چکی تھی۔ اب مجھے اپنے دل میں ایک خوفناک خلا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دروازہ کھلا تھا کہ میں کچھ اعلیٰ وارفع زندگی کا مزہ چکھ لیتا لیکن پھر یہ دروازہ بھی زور سے بند ہو گیا اور میری زندگی کی تمام تر امید اور مقصد بھی ساتھ لے گیا۔ میں اس وقت خود کو ایک ایسا مظلوم اور محروم شخص سمجھ رہا تھا جو شیریں خواب دیکھتے ہوئے سچ کی تلخیوں کا زہر اپنے اندر انڈیل لیتا ہے۔ کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر میں یہ ناراضی اس سے منسوب نہیں کر سکتا تھا، مجھے اس پر کوئی غصہ نہیں تھا بلکہ میں تو محض اداس اور افسردہ

تھا۔اب تو میں محض یہ سوچ سکتا تھا: ''یہ صورتِ حال اس حد تک نہیں پہنچنی چاہیے تھی۔'' یہ وہ سچ تھا جسے وہ مجھ سے محبت کرنے کی خاطر اپنی ذات میں نہیں پا سکتی تھی اور اس کی ایک معقول وجہ تھی۔ میری زندگی میں کبھی بھی کسی نے مجھ سے محبت نہیں کی تھی۔تاہم، خواتین پُراسرار مخلوق تھیں۔جن خواتین کو میں اب تک جانتا تھا یا جنہیں میں نے دیکھا تھا، ان کا اپنے ذہن میں تصور کرتے ہوئے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ محبت ان کے بس کی بات نہیں تھی۔جب وہ اس حیثیت میں تھیں کہ محبت کر سکیں، انہوں نے اس طرف قطعاً توجہ نہیں دی بلکہ وہ محض ناقابل حصول کی زحمت میں مبتلا تھیں اور انہوں نے محبت کے سنہری مواقع ضائع کر دیئے تھے، ان کے شکستہ دل غلاموں کی چاہ رکھتے تھے...... اور اسی چیز کو انہوں نے غلطی سے محبت سمجھ لیا تھا۔لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ ماریا کے متعلق میں غیر منصفانہ رویہ اختیار کر رہا تھا۔ہر چیز کے باوجود، مجھے بہ خوبی علم تھا کہ وہ محض دوسروں کی مانند نہیں تھی۔اور میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس نے کس قدر مصیبت اور تکلیف اٹھائی تھی۔اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ محض میری خاطر وہ یوں مصائب اور پریشانی کا سامنا کرے۔ وہ مصیبت اور پریشانی اس لیے بھگت رہی تھی کہ وہ اس چیز کی حسرت اور آرزو میں مبتلا تھی جو وہ اسے مل ہی نہیں سکتی تھی۔لیکن یہ سب کچھ کیا تھا؟ میرے پاس کیا نہیں تھا، بلکہ زیادہ درست طور پر یہ کہنا چاہیے کہ ہمارے پاس کیا کمی تھی؟

یہ سمجھنے کے بعد یہ کس تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک عورت نے ہمیں ہر چیز بخش دی ہے...... کہ اس نے درحقیقت ہمیں کچھ بھی نہیں دیا...... کہ وہ مزید قریب ہونے کی بجائے ہمیشہ کے لیے پرے ہو گئی تھی!

ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا! لیکن جیسا کہ ماریا نے کہا تھا، اب تو، خاص طور پر میری طرف سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا......

اسے کیا حق تھا کہ وہ مجھ سے یوں سلوک کرتی؟ جس طرح میرا معمول تھا، میں انسانوں کی صحبت سے گریز کرتا رہتا اور اوسط درجہ کی زندگی گزارتا رہتا لیکن کسی بھی موڑ پر مجھے یہ احساس نہ ہوتا کہ میری زندگی کس قدر کھوکھلی تھی: میں نے اپنی تمام زندگی اسی طرح گزاری تھی، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ میرے عجب و غریب مزاج کے سبب تھا، یہ کہ میں کبھی خوشگوار زندگی کے معنی جان نہ

پاتا۔ مجھے تنہائی برداشت کرنا پڑتی، اس یقین کے ساتھ کہ کسی روز میں بچ بھی سکتا ہوں۔اس وقت میرے ذہن کی اسی قسم کی کیفیت تھی جب ماریا، یا اس کی تصویر، میری زندگی میں داخل ہوئی۔اس نے مجھے میری تاریک اور خاموش زندگی سے نکالا اور سچ اور روشنی کے راستے پر لے آئی تھی۔اور اب وہ بغیر کسی وجہ کے اور اچانک غائب ہوگئی تھی جس طرح یکایک وہ میری دنیا میں داخل ہوئی تھی۔لیکن جہاں تک میرا تعلق تھا، مجھے یہ قطعاً امید نہ تھی کہ میں دوبارہ پرانی زندگی حاصل کر پاؤں گا۔ جب تک میں زندہ رہتا، میں دوردراز علاقوں کا سفر کرتا، ان لوگوں سے ملتا جن کی زبان میرے لیے اجنبی تھی، میں ہر جگہ جاتا اور میں ماریا پوڈر کو تلاش کرتا۔ ہر چہرے میں، میں اس کا چہرہ تلاش کرتا، ہر آنکھ میں، میں اس کی آنکھیں تلاش کرتا، میں فرکوٹ والی میڈونا کو تلاش کرتا۔ مجھے شروع سے ہی معلوم ہوگا کہ میں اسے کبھی تلاش نہیں کر پاؤں گا لیکن میرے بس میں نہ تھا کہ اس کی تلاش ترک کردوں۔اس نے تو مجھے صفر کی عمر بھر کی جستجو کا سزاوار ٹھہرادیا تھا جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔اسے مجھ سے یہ سلوک کرنا نہیں چاہیے تھا۔

ایسا معلوم ہورہا تھا کہ مستقبل کے ماہ وسال میرے لیے تاریک اور بے کیف ہی رہیں گے اور مجھے اس بوجھ کو برداشت کرنے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آئے گی۔ان خیالات سے لڑتے ہوئے میرے سامنے سے ایک پردہ اٹھ گیا تھا۔مجھے یاد آ گیا کہ میں کہاں تھا۔جو جھیل میرے سامنے موجود تھی، اس کا نام وانسی تھا۔ایک دن جب میں ماریا کے ساتھ فریڈرک دوم کے نئے محل کے پارک کو دیکھنے کے لیے پوٹسڈیم گیا، اس نے ریل کی کھڑکی سے انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے متعلق بتایا اور کہا کہ ایک صدی قبل، عظیم شاعر ہنریچ وین کلائسٹ اور اس کی محبوبہ نے ان درختوں تلے خودکشی کرلی تھی جہاں اس وقت میں کھڑا تھا۔

کون سی چیز مجھے یہاں لے آئی تھی؟ وہ کون سی لہر تھی جس نے مجھے ایک ایسی جگہ آنے پر مجبور کردیا تھا جس کی میں نے کبھی جھلک ہی دیکھی تھی؟ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں سیدھا یہاں پہنچا ہوں تاکہ اپنا وعدہ نبھا سکوں۔کیا یہ اس طرح ممکن تھا کہ اس شخص سے جدا ہونے کے بعد جس پر میں اس دنیا میں سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا......اس کی طرف سے یہ سننے کے بعد کہ ایک ایسا موقع آجاتا ہے جب دو لوگ ساتھ نہیں رہ سکتے ...... میں اس جگہ آ گیا تھا جہاں، حتیٰ کہ موت کے

منہ میں بھی دو لوگ اکٹھے گئے...... یہ کسی قسم کا ردِعمل تھا؟ یا پھر میں محض خود کو یہ قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دنیا میں ایسے بھی عاشق و معشوق بھی تھے جنہوں نے جدا ہونے سے انکار کر دیا تھا؟ میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ ان خیالات کی رَو کی میری یادو ھندلی ہے۔ لیکن یکدم مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پیروں تلے زمین جل رہی تھی! میں تقریباً دیکھ سکتا تھا کہ دونوں عاشق و معشوق میرے سامنے پڑے تھے، ایک گولی ایک کی چھاتی میں جبکہ دوسری گولی دوسرے کے سر میں پیوست ہوگئی۔ پھر گھاس پر خون کی دوندیاں بہنے لگیں اور اس تالاب تک پہنچنے لگیں جو میرے پیروں کے اردگرد بن گیا تھا۔ ان کی قسمت کی مانند، ان کا خون بھی باہم مدغم ہو گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک محض چند قدم کے فاصلے پر موجود تھے، پہلو بہ پہلو...... جب میں واپس مڑا...... میں اسی راستے پر تیزی سے بھاگ نکلا جس سے میں ادھر آیا تھا۔

میں نیچے جھیل سے اٹھتی ہنسی سن سکتا تھا۔ میں اپنے گرد گھومتے ہوئے جوڑے دیکھ سکتا تھا جبکہ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کی کمر کو سہارا دیئے ہوئے تھے کہ جیسے وہ ایک نہ ختم ہونے والے سفر پر روانہ ہونے والے ہوں۔ بار بار سرائے کا دروازہ کھلتا، موسیقی اور ان لوگوں کی مانند تھرکتے پاؤں کی جھلک سنائی دیتی جو پھسلتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر چلے گئے تھے اور زیادہ امکان یہ تھا کہ وہ مشروب کے علاوہ رقص سے بھی لطف اندوز ہوں۔

وہ سب تفریح کر رہے تھے۔ ان میں زندہ دلی کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ اس وقت میں ایک طرف کھڑا تھا اور اپنے ہی خیالات میں مقید تھا...... اور سب کچھ دیکھ رہا تھا...... لیکن اس طرح نہیں دیکھ رہا تھا کیوں کہ اب مجھے ادراک ہوا کہ میں اوپر سے نہیں بلکہ نیچے سے دیکھ رہا تھا۔ یہ حماقت نہیں تھی جس کے باعث میں نے ہر قسم کی صحبت ترک کر دی تھی۔ میں نے انسانوں سے اس لیے کنارہ کشی کر لی تھی کیوں کہ میں اپنی ذات کا ایک حصہ کھو بیٹھا تھا۔ لیکن زندگی کا مقصد اسے جینا تھا کہ جس طرح یہ لوگ جی رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی سے اپنا حصہ وصول کر رہے تھے اور زندگی کو کچھ واپس کر رہے تھے۔ میرا ان سے کیا تقابل تھا؟ ان سے الگ ہو کر میں کیا کرتا جس کی زندگی کو گھن لگ چکا تھا؟ یہ گراموفون، یہ سرائے، برف سے ڈھکی ہوئی جھیل، برف پوش درخت اور بے ترتیب ہجوم: وہ سب ان کاموں میں مصروف تھے جو زندگی نے انہیں بخشے تھے۔ ان کے ہر کام

میں کوئی نہ کوئی معنی پوشیدہ تھا خواہ پہلی نظر میں اس کا احساس نہ ہو۔ اور میں محض وہ پہیہ تھا جو اپنے دھرے پر گھوم رہا تھا اور جو ابھی تک خالی پن میں ڈوبا ہوا دلیلیں تلاش کر رہا تھا۔ بلاشبہ، میں اس دنیا کا ناکارہ ترین شخص تھا، مجھ جیسے ناکارہ شخص نے اس دنیا کو مزید بدترین بنا دیا تھا۔ میں نے کسی سے کوئی امید وابستہ کر رکھی تھی اور نہ ہی اس دنیا میں کسی کو مجھ سے کوئی توقع تھی۔

اسی لمحے میری اندر کوئی چیز تبدیل ہوگئی جس نے مجھے زندگی کے ایک نئے راستے پر گامزن کر دیا اور اس کے بعد سے میں نے خود کو ناکارہ اور بے وقعت سمجھنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میں واپس زندگی کی طرف لوٹ رہا ہوں...... زندگی کی سرزمین کی طرف واپس آ رہا ہوں۔ جیسے جیسے میں اپنے حالات میں تبدیلی پر غور کرتا تو پھر میں چند دنوں کے لیے خود کو تسلی دے دیتا لیکن جلد ہی میں اپنے اس گہرے یقین کی طرف واپس آ جاتا کہ یہ دنیا میرے کسی کام کی نہیں۔ میں کسی طرح بھی اس دنیا کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا...... اور نہ آج ہی میں اس دنیا کے اثر سے آزاد ہوں اور بہت برس بعد بھی میں اس لحہ کی بھرپور قوت کا ادراک کر سکتا ہوں جب دنیا نے مجھے دھتکار دیا اور میرا حوصلہ و ہمت ٹوٹ گئی۔ میں واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں کہ میرا یہ یقین کسی غلط فہمی پر مبنی نہیں تھا......

میں تیزی سے پختہ سڑک پر چلنے لگا اور واپس برلن کی طرف ہولیا۔ گزشتہ رات سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن مجھے بھوک کی نسبت متلی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ میری ٹانگیں تھکی نہیں تھیں لیکن میرے بدن کا ہر عضلہ تشنج میں مبتلا تھا۔ اب میں گہرے خیالوں میں کھویا ہوا نہایت آہستگی سے چل رہا تھا۔ جس قدر شہر قریب آتا جا رہا تھا، میری مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں یہ حقیقت قبول ہی نہیں کر سکتا تھا کہ میں یہ تمام دن اس کے بغیر گزاروں گا...... یہ خیال مجھے بہت ہی اجنبی، مجہول اور ناممکن معلوم ہو رہا تھا...... لیکن اس کے باوجود میں اپنا سر جھکائے، اس سے درخواست کرنے، اس سے التجا کرنے اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ یہ میری فطرت میں ہی نہیں تھا؛ یہ محض بے مقصد ہوتا...... میں نے اپنے تصور میں وہ جنونی مناظر مجتمع کیے جو محض میرے بچپن کے خوابوں کی مانند تھے لیکن فرق صرف یہ تھا کہ وہ کہیں زیادہ شوخ، بے باک اور زیادہ سے زیادہ بعید از قیاس تھے۔ کس قدر شاندار ہوتا کہ جب میں اسے اس سے ذرا پہلے فون کرتا جب وہ

اٹلانٹک میں اپنا کام شروع کرنے کو ہوتی (بعدازاں میں اسے پریشان کرنے اور اسے الوداع کہنے کر معذرت طلب کر لیتا) اور اپنے سر میں گولی اتار دیتا جب وہ میری بات سن رہی ہو! یہ زہریلی آواز سنتے ہی وہ ایک لمحہ کے لیے توقف کرتی اور بغیر سوچے سمجھے پاگلوں کی طرح 'راعف! راعف' پکارنا شروع کر دیتی۔ اور محض اتفاق سے میں اس کے یوں پکارنے کی آواز زمین پر لیٹے اور اپنا آخری سانس لیتے سن لیتا، میں مسکراتے ہوئے اپنی جان دے دیتا۔ میرے جائے وقوع سے مطلق بے خبر ہوتے ہوئے وہ مایوسی کے عالم میں دیوانہ وار بھٹکنے لگتی اور دنیا و مافیہا سے اس قدر بے خبر ہو جاتی کہ پولیس کو بھی اطلاع نہ دے پاتی۔ اور جب، اگلے روز، وہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے اخبار کی ورق گردانی کرتی اور اس پُراسرار سانحہ کی تفصیلات پڑھتی، اس پر شرمندگی اور ندامت غالب آ جاتی۔ اسے یہ علم ہوتا کہ وہ مجھے فراموش نہیں کر سکے گی کہ اب تو میری یاد بھی اس کے خون میں رچی بسی رہے گی۔

اب میں انہی پُلوں کے پاس سے گزرتا ہوا شہر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس وقت تقریباً شام ہو چکی تھی اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری منزل کیا تھی۔ میں ایک چھوٹے سے پارک میں داخل ہوا اور بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ میری نگاہیں آسمان پر جم گئیں۔ برف میرے پاؤں کو یخ کر رہی تھی لیکن میں دنیا و مافیہا سے بے خبر وہاں گھنٹوں بیٹھا رہا۔ ایک عجب قسم کی بے حسی مجھ پر غالب آ چکی تھی۔ اوہ، شاید میں یہاں اس لیے بیٹھا تھا کہ ٹھنڈ سے مر جاؤں یا پھر اگلے دن گمنامی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں! جب چند روز بعد ماریا یہ خبر اخبار میں پڑھے گی تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ اس کے چہرے پر کس قسم کا سایہ آ کر گزر جائے گا؟ اس پر کس قسم کا افسوس طاری ہوگا؟

میرے خیالات ایک دفعہ پھر اس کی طرف بھٹکنے لگے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور روانہ ہو گیا۔ شہر کے مرکز تک پہنچنے تک میرے پاس ابھی تک کئی گھنٹے موجود تھے۔ میں نے چلتے چلتے خود کلامی شروع کر دی۔ میں نے ہر وہ چیز دہرائی جو میں نے اس سے کہی تھی۔ میرا سر ہزاروں شاندار خیالات، ہزاروں فریب کن ترغیبات کی موجودگی میں چکرا رہا تھا کہ جس طرح کہ ان چند ابتدائی ایام میں ہوتا تھا جب ہم ساتھ تھے۔ لیکن بہر حال، مجھے علم تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا لفظ موجود

نہیں جواس کا ذہن تبدیل کر سکے۔ آنسوؤں سے لبریز اپنی آنکھوں اور کانپتی ہوئی آواز میں اسے بتاتا کہ ان دو افراد کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اس قسم کی بے تکلفی اور دوستی اختیار کرسکیں جو پہلے ہمارے درمیان موجود تھی، اس لیے یہ سوچنا ہی محال ہے کہ اس قسم کی مجہول وجہ کے باعث ہم جدا ہو جائیں...... ابتدائی طور پر اس کے لیے ایک ایسے شخص کو انتہائی منکسر المزاج اور کم گو دیکھنا عجیب سا محسوس ہوتا کہ جس طرح میں اسے اس قسم کے جذبات کے عالم میں بات کر رہا تھا لیکن وہ لمحہ بھی آن پہنچتا جب وہ آہستہ آہستہ میرے پاس آتی، میرے ہاتھ تھام لیتی، مسکراتی اور کہتی: ''تم درست کہتے ہو!''

ہاں...... میں نے اس سے ملاقات کر کے اسے سب کچھ بتا دینا تھا۔ ہر قیمت پر مجھے اسے مجبور کرنا چاہیے تھا کہ وہ اپنے اس خوفناک فیصلے کو تبدیل کر لے جس سے میں نے اس صبح بہت آسانی سے اتفاق کرلیا تھا۔ اور وہ اس فیصلے کو تبدیل کر دیتی۔ اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ممکن تھا کہ وہ اس رفتار سے خوف زدہ اور ناراض ہوگئی ہو جس رفتار سے میں گھر سے نکلا تھا اور کسی بھی قسم کا احتجاج بھی نہ کیا تھا۔ رات ڈھلنے سے پہلے فوراً ہی اس سے ملاقات کرنی چاہیے تھی۔

رات گیارہ بجے تک میں بے مقصد آوارہ گردی کرتا رہا اور پھر میں تیز رفتاری کے ساتھ اٹلانٹک کے سامنے پہنچ گیا تا کہ اس کی آمد کا انتظار کرسکوں لیکن وہ نہیں آئی۔ بالآخر میں نے اس دربان سے پوچھا جس کے کوٹ پر ستارہ ٹنکا ہوا تھا: ''مجھے معلوم نہیں، وہ آج رات نہیں آئی۔'' اس نے بتایا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی بیماری نے بدترین شکل اختیار کر لی ہوگی۔ میں بھاگم بھاگ اس کی عمارت کی طرف روانہ ہو گیا لیکن اس کے کمرے کی کھڑکی تاریک تھی۔ وہ لازماً سو رہی ہوگی۔ یہ بہتر سمجھتے ہوئے کہ اسے پریشان نہ کیا جائے، میں واپس پنشن آ گیا۔

تین روز میں نے اٹلانٹک کے باہر اس کا انتظار کیا، میں اس کی عمارت کے سامنے جاتا اور تاریک کھڑکی کو دیکھتا۔ لیکن مجھے کبھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کے کمرے تک جاؤں۔ ہر روز میں وہاں بیٹھ کر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا جبکہ میں صرف اوراق ہی پلٹتا رہتا، لفظ میری آنکھوں کے سامنے دھندلے پڑ جاتے اور بعض اوقات میں اپنی ہمت باندھتا اور پھر سے آغاز کرتا لیکن پہلی چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی میرا ذہن بھٹکنے لگتا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا فیصلہ قبول کرنے

کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں اور وقت گزرنے کا منتظر رہوں۔ لیکن جیسے ہی شام ہوتی، میرا تصور زیادہ زور پکڑ لیتا اور میرا ذہن ناممکن خیالات کی آماجگاہ بن جاتا۔ اور پھر رات گئے، میں سڑک پر نکل آتا اور دن بھر کے باندھے ارادوں کے برعکس اس کے گھر کے اردگرد یا کسی ایسی سڑک پر منڈلانا شروع کر دیتا جہاں اس کے آنے کی امید ہوتی۔ لیکن جب میں دربان سے اس کے متعلق پوچھتا، مجھے شدید شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا، اس لیے میں دور ہی سے دروازے پر نظر رکھتا۔ اسی طرح پانچ روز گزر گئے۔ میں اسے ہر رات اپنے خوابوں میں دیکھتا اور اسے پہلے سے کہیں زیادہ اپنے نزدیک پاتا۔

پانچویں روز، یہ دیکھنے کے بعد کہ وہ کام پر واپس نہیں آئی، میں نے اٹلانٹک فون کیا اور ماریا پوڈر سے بات کرنے کی خواہش کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بیماری کے باعث چند روز سے یہاں نہیں آ رہی۔ لہٰذا وہ واقعی بہت بیمار تھی۔ کیا میرے پاس اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ موجود تھی؟ مجھے کسی قسم کی تصدیق کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ اس کے لیے مشکل تھا کہ وہ اوقات کار تبدیل کر لیتی یا دربان کو کہتی کہ وہ مجھے دھکا دے کر نکال دے! میں اس کی عمارت کی طرف چل پڑا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اگر وہ سو بھی رہی ہو تو اسے جگا دوں گا۔ اس نے ہمارے تعلقات کی جو بھی حدود مقرر کی تھیں، ان سے قطع نظر مجھے یہ سب کرنے کا حق حاصل تھا۔ ہاں...... ہم دونوں ہی بہت زیادہ مدہوش تھے لیکن یہ درست نہیں تھا کہ اگلی صبح کو کسی بھی قسم کی اہمیت دی جائے۔

تیز رفتاری کے ساتھ میں سیڑھیوں کی جانب بڑھا اور ایک لمحہ توقف کیے بغیر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ محض مختصر سی گھنٹی بجی۔ پھر میں انتظار کرنے لگا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کئی بار اور پھر طویل گھنٹی بجائی۔ مجھے اس کے قدموں کی چاپ کا انتظار تھا لیکن مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر سامنے کا دروازہ دھماکے سے کھلا: یہ ملازمہ تھی جو نیم خوابیدہ تھی۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو یہاں رہتا ہے۔''

میرا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اس کے گلے سے غراہٹ خارج ہوئی: ''یہاں کوئی نہیں رہتا۔'' اور میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔

''کیا وہ یہاں سے چلے گئے ہیں؟''

جب وہ دوبارہ بولی تو اس کا لب ولہجہ نرم تھا کیوں کہ شاید اس نے میرے لہجے میں پریشانی کی جھلک محسوس کر لی تھی: ''اس کی ماں پراگ سے واپس نہیں آئی اور وہ بیمار پڑ گئی۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے شفا خانے کے معالج سے اسے ہسپتال بھجوا دیا۔''

یہ سنتے ہی میں تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا گا۔ ''وہ اس وقت کہاں ہے؟ کیا اس کی حالت نازک ہے؟ انہوں نے اسے کس ہسپتال بھجوایا ہے؟ اور کب......؟''

میرے ہیجانی سوالات سے پریشان ہو کر ملازمہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''چیخو مت، تم سب کو جگا دو گے...... وہ اسے دو روز پہلے ہسپتال لے گئے تھے، شاید خیراتی ہسپتال......''

''اسے کیا ہوا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم!''

میں نے اس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ سیڑھیوں کے چار چار قدمچوں کو پھلانگتا ہوا میں اسے حیرت کے عالم میں چھوڑ کر ہوا ہو گیا۔ پولیس کے جس پہلے اہلکار سے میرا سامنا ہوا، اس نے مجھے خیراتی ہسپتال کا پتہ بتا دیا۔ اس امر سے بے خبر کہ میں وہاں جا کر کیا کروں گا، میں سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ایک سو میٹر کے فاصلے پر واقع دیوہیکل پتھریلی عمارت کی پہلی جھلک دیکھتے ہی ایک سرد لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی لیکن میں نے ہمت کی اور پھاٹک کو عبور کرتا ہوا دربان کے پاس پہنچا۔ اگرچہ مجھ سے حق سے زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا گیا...... میں آخر نصف شب وہاں پہنچا تھا اور دربان کو یخ بستہ سردی میں بازحمت دی تھی...... وہ مجھے ماریا کے متعلق کچھ نہ بتا سکا۔ اسے حال ہی میں ہسپتال داخل ہونے والی کسی خاتون کا علم نہ تھا، تو اسے یہ علم کیسے ہو سکتا تھا کہ اسے کیا مرض لاحق تھا اور میں اسے کہاں تلاش کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی لاعلمی اور مایوسی کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی، میرے ہر سوال کا اس کے پاس ایک ہی جواب تھا: ''اگر تم کل صبح نو بجے آسکو، وہ تمہیں آگاہ کر سکیں گے۔'' اس کا محض یہی کہنا تھا۔

اس طویل رات کے دوران میں ہسپتال کی بلند پتھریلی دیواروں کے درمیان جس طرح تیزی سے بھٹک رہا تھا، اس نے مجھے خوب یاد دلا دیا کہ میں ماریا پوڈر سے کس قدر محبت کرتا

تھا اور کس بری طرح اب میں اس کی تلاش میں تھا؛ میرے خیالوں میں اب وہی تھی۔ جب میری نظران مریضوں پر پڑی جو مدھم زرد روشنی میں نہائی کھڑکیوں سے مجھ پر اپنی نظروں کی برچھیاں چلا رہے تھے، میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ان میں سے وہ کون ہوسکتی تھی۔ اوہ، میں کس طرح اب یہ خواہش کرسکتا تھا کہ میں اس کے پہلو میں ہوں، اس کی پیشانی سے پسینہ صاف کروں اوراس کی ہرضرورت کا خیال رکھوں!

اس رات مجھے یہ ادراک ہوا کہ اپنی زندگی کی نسبت کسی دوسرے سے زیادہ وابستہ رہنا کس طرح ممکن ہوسکتا تھا۔ اوراس رات مجھے یہ بھی سمجھ آ گئی کہ اس کے بغیر زندگی کس قدر خالی ہوتی کہ جس طرح کوئی اخروٹ کھوکھلا ہوتا ہے جسے ہوا فضا میں اچھالتی پھرتی ہے۔

اس وقت جبکہ برف کے گالے اس دیوار سے دوسری دیوار کی طرف اڑے جا رہے تھے، میں تقریباً اندھا ہو گیا تھا۔ سڑکیں ویران تھیں۔ کبھی کبھار کوئی برف سے سفید گاڑی سامنے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتی اور کچھ دیر بعد واپس چلی جاتی۔ جب میں دوسری دفعہ یہاں سے گزرا تو پولیس کا ایک اہل کار مجھے کافی دیر تک گھورتا رہا۔ تیسری بار میرے پاس سے گزرتے ہوئے بالآخر وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ میں یہاں کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا ایک عزیز اندر تھا جس پر اس نے مجھے اس وقت واپس گھر جانے اور اگلی صبح آنے کا مشورہ دیا لیکن جب ہمارا پھر سامنا ہوا تو اس نے مجھ پر ترحم بھری نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

جیسے ہی آسمان روشن ہوا تو جیسے ان سڑکوں پر بھی زندگی جاگ اٹھی۔ اب ہسپتال کے پھاٹک سے سفید کاروں کی آمدورفت پہلے سے کہیں زیادہ جاری تھی۔ ٹھیک نو بجے، میں نے وہاں موجود ڈاکٹر سے اندر آنے کی اجازت طلب کی، حالاں کہ اس دن ملاقاتیوں کو مریضوں کی عیادت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرے اجاڑ تاثرات تھے جس باعث اس نے بطور خاص مجھے اجازت دے دی۔

ماریا پوڈر ایک الگ کمرے میں تھی جس کی طرف ایک نرس نے میری رہنمائی کی اور یہ تاکید بھی کہ میں زیادہ دیر تک مریض کے پاس نہ رہوں کیوں کہ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اس کے پھیپھڑے میں سوزش تھی لیکن ڈاکٹر کے مطابق اس کی حالت نازک نہیں تھی۔ ماریا نے اپنا رخ

موڑا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی مسکرانے لگی۔ لیکن پھر اس کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ وہ ہوشیار نظر آنے لگی۔ جیسے ہی نرس کمرے سے باہر نکلی، اس نے کہا، ''راعف، کیا مسئلہ ہے؟''

اس کی آواز پہلے جیسی تھی لیکن اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ زرد تھا۔ اس کے مزید نزدیک ہوتے ہوئے میں نے کہا: ''کیا ہوا؟ تم نے خود کو دیکھا ہے؟''

''کچھ بھی تو نہیں...... میرا خیال ہے کہ میری طبیعت جلد ٹھیک ہو جائے گی...... لیکن تم مضمحل معلوم ہوتے ہو۔''

''گزشتہ رات اٹلانٹک والوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم بیمار ہو۔ میں تم سے ملاقات کرنے تمہارے گھر گیا لیکن ملازمہ نے مجھے بتایا کہ وہ تمہیں یہاں لے آئے ہیں۔ اس وقت انہوں نے مجھے اندر نہیں داخل ہونے دیا، اس لیے میں نے صبح تک باہر انتظار کیا۔''

''کہاں؟''

''یہیں، ہسپتال سے باہر......''

اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا جبکہ اس کے چہرے پر بہت افسردگی نظر آنے لگی۔ وہ کچھ کہنے لگی لیکن پھر کہتے کہتے رک گئی۔

اسی اثنا میں نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے ماریا کو الوداع کہا۔ اس نے سر ہلایا لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔

ہسپتال میں ماریا پوڈر کا قیام پچیس دن رہا۔ ممکن تھا کہ وہ اسے مزید ہسپتال میں رکھتے لیکن اس نے ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ ہسپتال میں مسلسل قیام سے بیزار ہو چکی تھی اور وہ اپنے گھر میں اپنی زیادہ بہتر دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ اپنے ساتھ ڈاکٹروں کی لمبی چوڑی نصیحتوں اور تجویز کردہ ادویات کی طویل فہرست کے ساتھ وہ ایک ایسے دن ہسپتال سے رخصت ہوئی جب برف باری ہو رہی تھی اور اپنے گھر چلی گئی۔ مجھے بہت کم یاد ہے کہ میں نے یہ پچیس دن کیسے گزارے۔ مجھے اس کے علاوہ کچھ یاد نہیں کہ میں باقاعدگی سے اس کی عیادت کو جاتا، اس کے پہلو میں بیٹھ جاتا، اس کی خالی نظروں کو دیکھتا، اس کا چہرہ پسینے میں شرابور ہوتا اور سانس لینے میں دقت کے باعث اس کی چھاتی اوپر نیچے ہوتی رہتی۔ بلاشبہ، میں واقعی زندہ نہیں تھا کیوں کہ اگر میں زندہ ہوتا تو مجھے کم از

کم کچھ تفصیلات تو یاد ہوتیں۔ مجھے تو بس یہی یاد تھا کہ مجھ پر خوف طاری تھا، مجھے خوف تھا کہ شاید میں اسے کھو دوں۔ جب کبھی اس کی انگلیاں چادر سے باہر نکلتیں، یا اس کے پاؤں چادر کے نیچے کپکپاتے، مجھے اس پر موت کا سایہ دکھائی دیتا۔ میں موت کا یہ سایہ، اس کے چہرے، اس کے ہونٹوں، اس کی مسکراہٹ میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس کے چہرے، اس کے ہونٹوں، اس کی مسکراہٹ میں موت سے شکست نظر آتی، ایک خوفناک حقیقت کی قبولیت نظر آتی، حتیٰ کہ موت قبول کرنے کی رضامندی بھی نظر آتی...... کہ جیسے ان سب کو ایک مناسب موقع میسر آ چکا ہو۔ اور پھر میں کیا کرتا؟ ہاں، مجھے چاہیے تھا کہ میں اس کی بیماری کے آخری مراحل میں اس کی دیکھ بھال کرتا، سکون بحال رکھتا، اس کی ماں کو تسلی دیتے ہوئے ایک قبرستان کا انتخاب کرتا جو اس وقت پراگ سے واپس آ چکی ہوتی، اور بالآخر چند دیگر افراد کی ہمراہی میں ہم اسے دفن کر دیتے......

تھوڑی دیر بعد ہر شخص یہاں سے رخصت ہو جاتا لیکن میں چوری چھپے واپس آ جاتا اور اس کی قبر کے پاس اکیلا کھڑا ہو جاتا۔ اور اسی وقت ہی اس کا آغاز ہو جاتا، اس وقت ہی میں واقعی اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیتا۔ اور پھر میں کیا کرتا؟ میں اس لمحے تک یہ تمام کچھ اپنے تصور میں لا سکتا تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ درست ہے، جب ہم اسے دفن کر دیتے اور ہر کوئی اپنی اپنی راہ لیتا، اس کے بعد میں کیا کرتا؟ اس کے بعد میرے پاس کوئی کام نہ ہوتا کہ اس کے متعلق کچھ کروں اور پھر اس کرۂ ارض پر بدستور جینے کا عمل بے مقصدیت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ذرا غور کرنے پر معلوم ہوتا کہ یہ عمل تو محض روح کے فنا ہونے کا تھا۔ ایک روز، جب اس کی حالت میں کچھ بہتری کے آثار پیدا ہوئے، اس نے کہا: ''ڈاکٹروں سے بات کرو، وہ مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں۔'' اور پھر بے پراوئی سے سرگوشی کرتے ہوئے اس نے کہا: ''تم بہتر طور پر میری دیکھ بھال کر لو گے۔''

مزید کسی بات کے بغیر میں کمرے سے فوراً باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر چاہتے تھے کہ وہ مزید چند روز یہاں رہے، اس پر ہم نے اتفاق کر لیا۔ اور پھر بالآخر چھبیسویں روز، میں نے اس کا فرکوٹ اس کے شانوں کے گرد لپیٹ دیا اور اسے سہارا دیتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتارا۔ میں نے اسے ایک ٹیکسی میں اس کے گھر پہنچایا اور ڈرائیور کے ساتھ ہم اسے بالائی منزل تک لے گئے۔ لباس تبدیل کرتے اور بستر میں لیٹنے تک وہ بہت زیادہ تھک چکی تھی۔

اس کے بعد واقعتاً صرف میں ہی تھا جو اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک بوڑھی عورت صبح آتی جو صفائی ستھرائی کرتی، چولہا جلاتی اور مریض کے لیے کھانا پکاتی۔ میری طرف سے بار بار استدعا کرنے کے باوجود اس نے اپنی والدہ کو بلانے سے انکار کر دیا۔ والدہ کے نام خطوط میں وہ اپنی لرزتی انگلیوں سے لکھتی: ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اچھا وقت گزاریں اور موسم سرما وہیں بسر کریں۔''

''اگر میری والدہ آ بھی جائیں تو میری کچھ مدد نہ کر سکتیں۔ انہیں تو خود مدد کی ضرورت ہے...... اور میری فکر کرنے سے پہلے ہی غیر ضروری طور پر فکر مندی میں مبتلا ہو جائیں گی۔'' اور پھر اسی زندہ دلی کے عالم میں سرگوشی میں مجھے کہتی: ''اور تم تو میری دیکھ بھال کر ہی رہے ہو۔ یا اب تھک چکے ہو اور تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا ہے؟''

لیکن وہ یہ کہتے مذاق نہیں کر رہی ہوتی تھی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی نہیں ہوتی تھی۔ بیمار ہونے کے بعد وہ بمشکل ہی کبھی مسکرائی تھی۔ جب اس نے پہلی بار مجھے ہسپتال میں دیکھا تھا تو وہ مسکرائی تھی لیکن اس کے بعد وہ سنجیدہ ہو گئی۔ جب کبھی وہ مجھ سے کچھ طلب کرتی یا پھر کسی بات کا شکریہ ادا کرتی، یا کسی بھی چیز کے متعلق مفصل گفتگو کرتی، اس کا انداز بہت ہی متفکرانہ ہوتا۔ میں رات گئے اس کے ساتھ بیٹھا رہتا اور صبح جلد واپس آ جاتا۔ بعد ازاں میں نے اس کمرے میں ایک بڑے صوفے پر سونے کا انتظام کر لیا، کمبل میں اس کی والدہ کی خواب گاہ سے لے آتا۔ ہم اپنے درمیان نامناسب واقعے کے متعلق بالکل بھی بات نہ کی...... حالاں کہ ایسا کہنا زیادہ مناسب نہیں ہوگا...... جب ہم نے سالِ نو پر صبح ہلکی پھلکی گفتگو کی تھی۔ ہسپتال میں اس کی عیادت کے لیے میری آمد اور اس کے ساتھ وقت گزارنا جب سے میں اس کے گھر آیا تھا، یہ سب کچھ اس فطری انداز میں پیش آیا تھا کہ اس کے متعلق بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بلاشبہ، ہم میں سے دونوں نے موجودہ صورتِ حال کا خفیف ساذکر کرنے سے بھی احتراز کیا تھا۔ لیکن پھر بھی واضح طور پر وہ کسی چیز پر غور کر رہی تھی۔ جب میں اپارٹمنٹ میں کسی کام میں مصروف ہوتا، یا اسے کوئی چیز بلند آواز سے پڑھ کر سنا رہا ہوتا، مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اس کی آنکھیں مسلسل مجھ پر جمی ہوئی ہیں، یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ مجھ میں کسی چیز کی تلاش میں تھی۔ ایک دن میں لیمپ روشن کیے

اسے جیکب واسرمین کی کہانی "The Mouth That Was Never Kissed" بلند آواز سے پڑھ کر سنا رہا تھا۔ یہ کہانی ایک ایسے استاد کی تھی جو محبت سے قطعی واقف نہ تھا کہ یہ کس چڑیا کا نام تھا اور وہ اپنی تمام زندگی گزار کر یہ ادراک کیے بغیر بوڑھا ہو گیا کہ وہ تو محبت کی انسانی گرم جوشی کی حسرت اور آرزو میں مبتلا تھا۔ اس کہانی میں انتہائی ماہرانہ اور شاندار انداز میں ایک ایسے انسان کی کہانی بیان کی گئی تھی جو اپنی معدوم ہوتی امیدوں کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کرتا ہے جبکہ وہ اپنے گرد موجود کسی بھی شخص سے بے خبر ہوتا ہے۔ جب کہانی ختم ہو گئی، ماریا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی میں غرق ہو گئی۔ پھر وہ میری طرف مڑی اور ہنستی ہوئی کہنے لگی: ''تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ سالِ نو کے بعد اس عرصے کے دوران تم کیا کرتے رہے جب ہماری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔''

''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''واقعی؟''

''مجھے معلوم نہیں......''

کمرے پر ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ وہ اپنے موضوع سے ہٹ گئی تھی لیکن میں حیران نہیں تھا۔ بلاشبہ مجھے یہ احساس ہو گیا کہ میں کچھ دیر سے محض اسی سوال کا منتظر تھا۔ لیکن جواب دینے کی بجائے، میں نے اسے کچھ کھانے کو دیا۔ پھر میں نے اسے اچھی طرح لپیٹ دیا اور اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا: ''کیا میں تمہیں کچھ پڑھ کر سناؤں؟''

''جیسے تمہاری مرضی۔''

اب میرا یہ معمول بن چکا تھا کہ میں اسے رات کے کھانے کے بعد کچھ ہلکی پھلکی چیز پڑھ کر سناتا تاکہ وہ گہری نیند سو سکے۔ اس دفعہ میں نے ایک لحہ توقف کیا۔

''میں کیوں نہ تمہیں نئے سال کے بعد کے چند دنوں کے متعلق بتاؤں۔ یہ سن کر تمہیں فوراً ہی نیند آ جائے گی۔'' میں نے کہا۔

وہ میرے اس ہلکے سے مذاق پر قطعی نہیں مسکرائی؛ بلکہ اس نے محض سر ہلایا کہ جیسے وہ کہہ رہی ہو، ''ٹھیک ہے، سناؤ۔'' میں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ میں اپنی یادیں مجتمع کرنے کے لیے کبھی کبھی رک بھی جاتا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد میں

کہاں کہاں گیا، میں نے کیا کچھ دیکھا اور روانسی کے گرد آوارہ گردی ہوئے کن خیالات نے مجھ پر یلغار کی اور کس طرح شام ہوئی اور پھر میں نے برلن کی طرف رخ کیا......اس کی عمارت کے چکر پر چکر لگاتا رہا اور پھر آخر میں، میں نے اسے اُس شام کے متعلق بتایا جب میں نے سنا تھا کہ اسے ہسپتال لے جایا گیا تھا...... میں کس طرح بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا اور صبح تک انتظار کرتا رہا۔ میرا لب ولہجہ بہت ہی مدھم اور پُرسکون تھا کہ جس طرح میں ان واقعات کو اپنے ذہن میں لا رہا ہوں جو کسی اور کے ساتھ پیش آئے تھے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا...... ہر چیز جو مجھے یاد تھی......تھوڑا تھوڑا کر کے میں نے اسے تمام باتیں بتائیں...... کچھ کچھ تفصیل بھی بتاتا گیا...... اور وضاحت کرنے کی خاطر کچھ دیر کے لیے توقف بھی کرتا رہا۔ وہ یہ سب کچھ خاموشی سے آنکھیں بند کر کے سنتی رہی۔ وہ اس قدر بے حس وحرکت تھی کہ مجھے شک ہوا کہ جیسے وہ سو چکی ہو۔ تاہم، میں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے میں خود کلامی کر رہا ہوں۔ اب تو میں نے ان احساسات کا بھی اعتراف کر لیا تھا جنہیں میں نے اب تک تسلیم نہ کیا تھا، میں انہیں غلط ہی سمجھتا رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی بھی بامقصد نتیجے پر پہنچ سکتا، میں آگے بڑھ جاتا۔ صرف ایک بار، جب میں اسے بتا رہا تھا کہ میں نے ٹیلی فون پر الوداع کہتے ہوئے کیسا تصور باندھا تھا، اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس نے مجھ پر بغور نظر ڈالی اور پھر دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی چہرے کی ہر لکیر ساکت تھی۔

میں نے کچھ بھی نہیں چھپایا اور اس کی میں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی کیوں کہ میرا کوئی خاص مقصد ہی نہیں تھا۔ اب مجھے اپنے تصورات بہت ہی عجیب معلوم ہونے لگے جو وقت اور فاصلے کے لحاظ سے اب بہت دور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بہانہ یا عذر بھی نہیں تھا جو کچھ میں نے اسے بتایا تھا، یا جو کچھ میرے متعلق تھا؛ اس ضمن میں، میں انتہائی بے رحم ثابت ہوا تھا۔ مجھے کسی ایک وہم یا مغالطے کے متعلق بھی یاد نہیں جو اس رات مجھ پر طاری ہو گیا ہو جب میں باہر انتظار کر رہا تھا اور نہ ہی میں نے کسی وہم اور مغالطے کو اپنے ذہن پر سوار کرنے کی کوشش کی تھی۔ بس میری خواہش یہی تھی کہ میں ایک کے بعد دوسری کہانی سناتا جاؤں۔ میں نے ہر واقعہ کا اپنی ذاتی حیثیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے اپنے استحقاق کی حیثیت سے جائزہ لیا اور اس نے میری

ہر بات پوری توجہ سے سنی، اگر چہ اس میں کسی بھی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے یہ اپنی ہڈیوں میں سرایت کرتا محسوس کیا۔ جب میں نے اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اپنے خیالات سے اسے آگاہ کیا کہ کس طرح میں نے اس کی موت کے حالات کو اپنے تخیل کی عینک لگا کر دیکھا تھا...... اس نے اپنی آنکھیں کئی بار جھپکائیں...... لیکن بس......

آخر کار میں اپنی کہانی کے انجام تک پہنچ گیا۔ اب یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں نے اب مزید کچھ نہیں کہنا، یا پھر اس کے پاس اب مزید کہنے کو کچھ نہیں۔ ہم وہاں شاید دس منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ میری طرف مڑی، کافی دیر کے بعد اپنی آنکھیں کھولیں اور پھیکے انداز (مجھے تو یونہی محسوس ہوا تھا) میں مسکراتے ہوئے نرم آواز میں کہنے لگی: ''کیا ہم سو جائیں؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا بستر تیار کیا۔ پھر میں نے لباس بدلا اور روشنیاں بجھا دیں لیکن مجھے نیند نہ آسکی۔ میں اس کی سانسوں سے بتا سکتا تھا کہ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں لیکن پھر بھی مجھے اس نرم آواز کا شدید انتظار تھا جس سے میں بہ خوبی شناسا ہو چکا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ نیند مجھ پر غلبہ نہ پا سکے لیکن پھر بھی ماریا سے پہلے مجھے نیند آگئی۔

علی الصباح میں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں ابھی تک اندھیرا تھا۔ پردوں سے ہلکی سی روشنی چھن کر آرہی تھی۔ لیکن وہ نرم اور شیریں آواز جس سے میں بہ خوبی آشنا ہو چکا تھا...... مجھے سنائی نہیں دی۔ کمرے میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اپنی حدوں کو پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں کے دلوں میں بہت کچھ ابل رہا تھا۔ میں بہت ہی بے چینی کے عالم میں یہ محسوس کر سکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر ایک خوفناک بے تابی بھی طاری تھی؛ وہ کتنی دیر بعد بیدار ہوگی؟ یا کیا وہ سوئی نہیں تھی؟ ہم دونوں بے حس و حرکت تھے لیکن ہمارے خیالات کمرے میں گردش کر رہے تھے۔

میں نے آہستہ سے نظر اٹھا کر دیکھا کہ اب میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ماریا کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں جب کہ اس کا سر تکیے پر تھا۔ صبح بخیر کہتے ہوئے میں دوسرے کمرے میں منہ دھونے چلا گیا۔ جب میں واپس آیا تو مریض ابھی تک اسی حالت میں تھی۔ میں نے پردے ہٹا دیئے۔ نائٹ بلب بجھا دیا، اپنا بستر تہ اور صوفہ درست

کیا۔ ملازمہ کے آنے پر میں نے دروازہ کھولا اور دودھ پینے میں ماریا کو مدد دی۔

اس دوران میں نے بمشکل ایک لفظ بھی نہ بولا تھا۔ ہر صبح میرا یہی معمول تھا اور پھر میں فیکٹری روانہ ہو جاتا جہاں میں دوپہر تک رہتا۔ بعد دوپہر میں اسے کسی کتاب یا اخبار سے کچھ پڑھ کر سناتا۔ میں اسے دنیا جہان کی چیزوں کے متعلق بتاتا جنہیں میں دیکھ یا سن چکا تھا اور پھر شام ہو جاتی۔ کیا یہی معمول جاری رہنا تھا؟ درحقیقت، مجھے یقین نہیں تھا۔ لیکن ہر چیز اپنے فطری انداز کے مطابق اپنی جگہ موجود تھی۔ خواہشات مجھے اس معمول سے ہٹا نہیں سکی تھیں، مستقبل یا ماضی کے متعلق بھی مجھے کچھ خیال نہیں تھا جبکہ میں محض حال میں ہی زندہ تھا۔ میری روح ساکت اور بے حس وحرکت سمندر کی مانند تھی۔

شیو کرنے اور لباس پہننے کے بعد، میں نے ماریا کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا: ''تمہیں علم تو ہے کہ میں فیکٹری جا رہا ہوں۔''

''آج اگر تم نہ جاؤ تو کیا ہو؟''

''یہ ممکن ہے، لیکن کیوں؟''

''مجھے معلوم نہیں...... میں چاہتی ہوں کہ تم آج دن بھر میرے ساتھ رہو۔''

میرے نزدیک اس کی یہ خواہش مبہم تھی لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے وہ اخبار کھول لیا جو ملازمہ میز پر چھوڑ گئی تھی۔

ماریا کچھ پریشان بلکہ مایوس معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اخبار نیچے رکھ دیا اور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا، اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا۔ ''تم آج کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں...... کچھ بہتر ہوں......''

اگرچہ وہ اس وقت بالکل ساکت بیٹھی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ چاہتی تھی کہ میں اپنا ہاتھ اس کی پیشانی سے نہ ہٹاؤں۔ اور پھر اس دوران میں نے یوں محسوس کیا کہ وہ اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنے کو تھی۔

خوش مزاجی کی کوشش میں، میں نے کہا: ''تم کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو۔ لیکن پھر تم

رات بھر سوئی کیوں نہیں؟''

میرا یہ کہنا تھا کہ اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ گردن سے رخساروں تک اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کوئی عذر تلاش کر رہی تھی کہ اس سوال کا جواب نہ دینا پڑے۔ پھر یکایک اس نے اپنی آنکھیں موند کر لیں، اس طرح پیچھے جھکی کہ جیسے اس کی توانائی زائل ہو چکی ہو۔ انتہائی نرم لب و لہجے میں اس نے کہا،'' آہ، راعف......''

''کیا بات ہے؟''

اس نے بمشکل خود کو اوپر اٹھایا۔'' کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا، ''میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ تم آج مجھے تنہا نہ چھوڑو......کیا تمہیں علم ہے کہ کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اس کا تعلق اس سب سے ہے جو تم نے مجھے گزشتہ رات بتایا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر تم چلے گئے، یہ سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ میرے ذہن پر وارد ہو جائے گا اور مجھے ایک لمحہ بھی ذہنی سکون میسر نہ ہوگا۔''

''اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں کبھی نہ بتلاتا۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنا سر ہلایا:''نہیں، میرا مطلب یہ نہیں......میں اپنے متعلق نہیں سوچ رہی......اب بات محض یہ ہے کہ میں اب مزید تم پر بھروسا نہیں کر سکتی! مجھے ڈر لگ رہا کہ تم مجھے اکیلا چھوڑ دو گے......تم ٹھیک کہتے ہو......میں گزشتہ تمام رات بمشکل ہی سو سکی......میں تمام رات تمہارے متعلق ہی سوچتی رہی۔ میں صرف وہی سوچتی رہی جو کچھ تم اس دن کر رہے تھے جب تم مجھ سے رخصت ہوئے تھے، اور پھر ان تمام چیزوں کے متعلق جو تم نے بتایا تھا اور ان کاموں کے متعلق بھی جو تم نے نہیں کیے......یہی وجہ ہے کہ میں اب تمہیں مزید اکیلا نہیں چھوڑ سکتی! مجھے خوف محسوس ہوتا ہے......اور میں آج تم سے یونہی باتیں نہیں کر رہی...... میں تمہیں اب کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔''

پسینے کے ننھے ننھے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار ہو گئے جنہیں میں نے آہستگی سے صاف کر دیا اور میری ہتھیلی گرم اور گیلی ہوگئی۔ میں حیرت کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔ اب وہ مسکرانے لگی، پہلی خالص، معصوم اور کشادہ مسکراہٹ جو میں نے کبھی دیکھی تھی۔ آنسو اس کے

رخساروں پر بہ رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اب اس کی مسکراہٹ مزید نرم ہو چکی تھی، بہت ہی نفیس اور نرم مسکراہٹ؛ لیکن آنسو بدستور بہ رہے تھے۔ اس کی زبان خاموش جبکہ اس کا سینہ ساکت تھا۔ میں نے کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ اس ساکت حالت میں کوئی رو بھی سکتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ننھے سفید پرندوں کی مانند تھے جو سفید چادر پر ٹکے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور انہیں پیار سے سہلایا۔ اس کی انگلیاں جو مڑی ہوئی تھیں، دوبارہ سیدھی ہو گئیں اور پھر میرے ہاتھ میں ایک مٹھی کی شکل میں بھنچ گئیں۔ اس کی ہتھیلی کی لکیریں، کسی پتے کی رگوں کی مانند تھیں۔

آہستگی سے میں نے اسے پھر دوبارہ تکیے سے ٹیک لگانے میں مدد دی۔

''خود کو اذیت مت دو۔'' میں نے کہا۔

اس کی آنکھیں اب چمکنے لگیں اور وہ کہنے لگی: ''نہیں، نہیں......'' اور اس نے میرا بازو تھام لیا۔ پھر یوں جیسے وہ خود کلامی کر رہی ہو، کہنے لگی: ''اب مجھے ادراک ہو چکا ہے کہ مجھے کس چیز کی تلاش تھی، میں کس کے بغیر ادھوری تھی، میں کس کے بغیر اداس تھی...... جو تم میں نہیں بلکہ مجھ میں ہے...... میں یقین نہیں کر سکتی...... میں یہ قطعاً یقین نہیں کر سکتی کہ تمہیں مجھ سے اس قدر محبت تھی جس قدر میں تم سے کرتی تھی اور پھر بھی میں یہ سمجھتی رہی کہ مجھے کسی سے محبت نہیں تھی...... اب میں سمجھ چکی ہوں...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی ہے...... لیکن اب میں سب کچھ سمجھ سکتی ہوں...... تم نے مجھے سکھا دیا ہے کہ کیسے...... مجھے تم سے محبت ہے...... دیوانگی کے عالم میں نہیں...... بلکہ صاف ذہن کے ساتھ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں...... میں تمہیں چاہتی ہوں...... میں تمہیں بہت زیادہ چاہتی ہوں...... اگر میں بہتر ہو سکتی...... میں کب ٹھیک ہوں گی؟''

بغیر کچھ بولے میں نے اپنے رخساروں سے اس کی آنکھوں کے آنسو صاف کیے۔

پھر میں اس کے پہلو میں اس وقت تک بیٹھا رہا جب اس میں اس قدر ہمت اور توانائی پیدا ہو گئی کہ وہ کھڑی ہو سکے۔ اگر مجھے اشیائے خورونوش یا پھر سوپ لینے یا پھر لباس تبدیل کرنے کے لیے پنشن جانا پڑتا، وہ دو یا تین گھنٹوں کے لیے اکیلی ہو جاتی جو میرے نزدیک بہت زیادہ

وقت تھا۔ جب میں اس کا ہاتھ تھام کر کاؤچ پر بیٹھ جاتا یا پھر اس کے کندھوں پر پتلی سی سویٹر ڈالتا، مجھے وہ لامحدود خوشی محسوس ہوتی جو اپنی زندگی کسی کے لیے وقف کر دینے سے محسوس ہوتی ہے۔ ہم کھڑکی کے سامنے بیٹھ جاتے، گھنٹوں باہر دیکھتے رہتے، منہ سے کچھ نہ بولتے، اور کبھی کبھار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے؛ اس کی بیماری نے مجھے اس بچے سے آشنا کر دیا تھا جو اس کے اندر موجود تھا اور میری خوشی نے یہی کام میرے لیے انجام دیا تھا۔ چند ہی ہفتوں میں اس کی توانائی اور طاقت بہت حد تک بحال ہو گئی۔ جب موسم اچھا ہو گیا، ہم نے سڑکوں پر نصف گھنٹے کے لیے چہل قدمی شروع کر دی۔

اب وہ لباس پہننے کے ضمن میں بھی احتیاط برتنے لگی؛ جب لباس تبدیل کرنے وہ کبھی جھکتی، اس پر کھانسی کا دورہ پڑ جاتا، اس لیے اسے موزے مجھے پہنانے پڑتے تھے۔ پھر وہ اپنا فرکوٹ پہنتی اور میں آہستہ سے سیڑھیاں اترنے میں اس کی مدد کرتا۔ گھر سے پچاس میٹر دور ہم ایک چوبی بنچ پر بیٹھ جاتے اور آرام کرتے۔ وہاں سے ہم چہل قدمی کرتے ہوئے بئیر گارٹن کی طرف روانہ ہو جاتے، تالاب کی طرف جاتے تاکہ پانی کی بہتی لہروں پر تیرتی بطخوں کو دیکھ سکیں۔

پھر ایک دن یہ سب کچھ انجام کو پہنچ گیا...... یہ سب کچھ اس قدر سادہ انداز میں، اس قدر یکایک ختم ہوا کہ میں اس کی سنگینی سمجھنے سے قاصر رہا...... مجھے حیرت تو کم ہوئی لیکن میں افسردہ بہت زیادہ تھا؛ اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ایسا بہت زیادہ اور مستقل اثر مجھ پر مرتب کر دے گا۔

ان آخری ایام میں، میں واپس پنشن جانے سے ہچکچاتا رہا تھا۔ اگرچہ اپنے کمرے کا کرایہ پیشگی ادا کر رہا تھا، اس کے باوجود بھی انتظامیہ نے میرے ساتھ سرد مہر رویہ اختیار کر لیا کیوں کہ میں کبھی کبھار ہی وہاں جاتا تھا۔ ایک دن فاؤ ہینبر کہنے لگی: ''اگر تم کہیں دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہو، تو ہمیں بتا دو تاکہ ہم پولیس کو مطلع کر سکیں، ورنہ وہ ہمیں قصوروار سمجھیں گے۔''

میں نے صورتِ حال کی سنگینی ختم کرنے کی کوشش کی اور کہا: ''میں تمہیں کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟'' اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں وہاں ایک برس سے زیادہ عرصہ رہا تھا اور تر کی سے جو میں اپنے ساتھ ذاتی اشیا لایا تھا، مثلاً کتابیں جو کمرے میں بکھری ہوئی تھیں، مجھے قطعی اجنبی

محسوس ہو رہی تھیں۔ اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے میں نے چند ضروری اشیا نکالیں اور انہیں ایک اخبار میں لپیٹ دیا۔ پھر ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''تمہارے لیے ٹیلی گرام ہے جو تین دن پہلے آیا تھا۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے ایک تہ شدہ کاغذ مجھے تھما دیا۔

پہلے تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کہہ کیا رہی تھی۔ کسی طرح میں اس کے ہاتھ سے ٹیلی گرام لینے کے لیے خود کو تیار نہ کر سکا۔ نہیں، کاغذ کے اس ٹکڑے کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا...... میں نے یہ امید وابستہ کر لی تھی کہ جو کوئی بھی سانحہ سر پر منڈلا رہا تھا، میں اس سے اس وقت اجتناب کر سکتا تھا جب تک میں وہ ٹیلی گرام نہ پڑھتا۔

ملازمہ بے یقینی کے عالم میں مجھے گھور رہی تھی۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے کہ میں اس سے یہ پرچہ لینے کے لیے تیار نہیں، اس نے وہ ٹیلی گرام میز پر رکھ دیا اور کمرے سے چلی گئی۔ پھر میں نے ٹیلی گرام پڑھنے کے لیے اسے کھولا۔

یہ ٹیلی گرام میرے بہنوئی کی طرف سے تھا۔ ''تمہارے والد فوت ہو گئے ہیں۔ رقم روانہ کر دی گئی ہے۔ فوراً واپس آ جاؤ۔'' بس یہی لکھا تھا۔ محض نو یا دس الفاظ، جن کا مطلب صاف ظاہر تھا...... لیکن پھر میں ابھی تک کاغذ کو گھور رہا تھا۔ میں نے اس پر لکھی تحریر بار بار پڑھی، ہر لفظ بار بار پڑھا۔ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا، سامان کا پارسل اپنی بغل میں دبایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کیا صورتِ حال پیش آئی تھی؟ مجھے اپنے اردگرد کوئی بھی چیز تبدیل ہوتے نظر نہیں آئی۔ سب کچھ ایسا ہی تھا جب میں یہاں آیا تھا۔ مجھے خود یا اپنے اردگرد کی دنیا میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ ماریا کھڑکی پر میری منتظر ہوتی لیکن اب میں نصف گھنٹہ پہلے والا شخص نہیں تھا۔ ہزاروں کلومیٹر دور، ایک شخص کی سانس تھم گئی تھی اور اگرچہ یہ واقعہ ہفتوں پہلے نہیں تو یقیناً دنوں پہلے پیش آیا تھا، ماریا یا میں نے اسے محسوس نہیں کیا تھا۔ ہر دن پہلے کی مانند تھا۔ لیکن اچانک کاغذ کے ایک معمولی سے ٹکڑے نے ہماری زندگی تہ و بالا کر دی تھی، میری زندگی کو میرے پاؤں کے نیچے سے سرکا دیا تھا، اس جگہ سے مجھے بہت دور پھینک دیا تھا اور مجھے ایک دور افتادہ سرزمین کی یاد دلا دی تھی جہاں سے میں آیا تھا اور وہ سرزمین اب مجھ پر اپنا حق جتلا رہی تھی۔

میں اسے اب کہیں زیادہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ یہ میں سمجھتے ہوئے کس قدر غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ گزشتہ چند مہینوں کی میری زندگی حقیقی تھی؛ اور میری یہ امید کہ میری یہ زندگی ہمیشہ یونہی رہے گی۔ لیکن پھر بھی میری یہ شدید خواہش تھی کہ اس ناگزیر صورتِ حال سے محفوظ و مامون رہوں! ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات اس قدر اہمیت کی حامل نہیں ہونی چاہیے تھی کہ ہم کہاں پیدا ہوئے، ہم کس کی اولاد تھے۔ بلکہ اس بات کی اہمیت ہونی چاہیے تھی کہ دو افراد نے ایک دوسرے کو پا لیا تھا اور ایک منفرد قسم کی خوشی حاصل کر لی تھی۔ باقی سب حادثاتی تھا اور اب اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ اسی جگہ رہا جائے اور بھرپور خوشی سے لطف اندوز ہوا جائے۔

لیکن دلی طور پر میں جانتا تھا کہ حالات اس طرح رخ نہیں بدلیں گے کیوں کہ معمولی معاملات اور امور ہی ہماری زندگیوں کی سمت متعین کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ معمولی معاملات اور امور ہی ایک سچی اور حقیقی زندگی کا مجموعہ تھے۔ ہماری ذہنی منطق ہمیشہ سے ہی بذاتِ خود زندگی کی منطق سے ممیز رہی تھی۔ ایک خاتون ریل گاڑی کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتی ہے اور کوئلے کی دھول اس کی آنکھوں میں جا پڑتی ہے اور یہ خاتون اسے قطعی اہمیت نہ دیتے ہوئے اپنی آنکھیں ملنا شروع کر دیتی ہے لیکن اس کا یہ خفیف عمل اس کی آنکھوں کی بینائی چھین لیتا ہے۔ یا پھر کوئی اینٹ ہوا میں اڑتے آتی ہے اور کسی مشہور شخص کے سر پر جا پڑتی ہے۔ اور اس سے کیا فرق پڑتا کہ یہ استفسار کیا جائے کہ اہم کیا ہے...... آنکھ یا کوئلے کی دھول، اینٹ یا دماغ؟ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ ہم اس قسم کے حادثات کے علاوہ ان تمام چیزوں کو جوں کا توں قبول کر لیں جو زندگی ہمارے اوپر مسلط کرتی ہے۔

کیا یہ سب کچھ واقعی سچ ہو سکتا تھا؟ ہاں، دنیا ان قوتوں کے زیر اثر ہے جو ہماری گرفت میں نہیں یا جن کا اہم ادراک نہیں کر سکتے۔ یہی سچ ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ قوتیں ایک فطری دنیا کی طرز پر وجود میں آئیں تو پھر ناسازگار اور ناموافق حالات کی بہت سی صورتیں تھیں جن سے احتراز کیا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر، حاروان سے مجھے کس چیز نے جوڑا ہوا تھا؟ زیتون کے درختوں کے چند جھنڈ، صابن کی دو فیکٹریاں اور وہ خاندان جس سے میں بمشکل واقف تھا اور مجھے

اس کے متعلق جاننے سے بھی چنداں دلچسپی نہیں تھی...... میری زندگی یہاں برلن میں تھی۔ میں ہر قابل تصور انداز میں اس جگہ سے جڑا ہوا تھا۔ تو پھر میں یہاں ٹھہر کیوں نہیں سکتا تھا؟ اس کا جواب بہت ہی سادہ تھا: جاروان میں ہمارا کاروبار ختم ہو جاتا، میرا بہنوئی مجھے رقم بھیجنا بند کر دیتا اور میں قلاش ہو جاتا۔ میرے پاسپورٹ، میرے رہائشی اجازت نامے اور سفارت خانے کی کارروائی کا بھی سوال تھا......اور یہ سب معاملات اس قدر اہم تھے کہ جن کی اہمیت ہم اکثر محسوس ہی نہیں کرتے۔ حالاں کہ میرے معاملے میں ان کی بہت زیادہ اہمیت تھی اور میری زندگی متشکل کرنے میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ ہوتا تھا۔

جب میں نے یہ سب کچھ ماریا پوڈر کے سامنے کھول کر رکھا، ایک لمحہ کے لیے وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے مجھ پر ایک عجیب قسم کی نظر ڈالی کہ جیسے کہہ رہی ہو، ''کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا؟'' جب میں خود پر ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ مجھے یہ خدشہ تھا کہ اگر میں نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تو شاید میں اس کی نگاہوں میں مضحکہ خیز نظر آؤں۔ لیکن پھر میں نے بہت بار کہا: ''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''تمہیں کیا کرنا چاہیے؟ بہت خوب، بلاشبہ تمہیں جانا چاہیے...... میں بھی کچھ دیر کے لیے چلی جاؤں گی۔ تاہم، میں جلد ہی اپنے کام پر واپس نہیں جاؤں گی۔ میں پراگ سے باہر اپنی ماں کے ساتھ قیام کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ مضافات میں میری زندگی میری صحت کے لیے اچھی ہوگی۔ میں موسم بہار وہیں گزاروں گی۔''

یہ کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اپنی پریشانی ایک طرف رکھ کر اس انداز سے اس کے منصوبوں کے متعلق گفتگو کروں۔ اس دوران کبھی کبھار وہ مجھ پر دزدیدہ نظریں ڈالتی۔

''تم کب جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم، شاید رقم پہنچتے ہی میں روانہ ہو جاؤں......''

''ممکن ہے میں تم سے پہلے ہی چلی جاؤں......''

''واقعی؟''

وہ میری حیرانی پر ہنس پڑی۔ ''تم تو ہمیشہ سے اندر سے بچے ہی رہے ہو، راعف۔

صرف ایک بچہ ہی اس ناگزیر صورتِ حال پر احتجاج کر سکتا ہے۔تاہم، ہمارے پاس بہت وقت ہے، اس لیے ہم کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے ہیں......''

میں ان چند معمولی معاملات کو نمٹانے کے لیے باہر چلا گیا جنہیں میں برلن سے رخصت ہونے سے قبل حل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پنشن کو بھی اطلاع دینی تھی۔اس وقت مجھے ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی جب میں شام کو گھر پہنچا تو دیکھا کہ ماریا نے تمام سامان باندھ لیا تھا اور جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

''کیا وقت ضائع کرنے کی کوئی تک ہے۔'' اس نے کہا،''میں سیدھی روانہ ہو جاؤں گی تاکہ تم اپنے سفر سے پہلے سب تیاری کر سکو......اور پھر......اوہ، مجھے معلوم نہیں......مختصر اور طویل وضاحت یہ ہے کہ میں نے تم سے پہلے ہی برلن سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے......مجھے واقعی معلوم نہیں کیوں......''

''جیسی تمہاری مرضی!''

اس موضوع پر ہمارے درمیان مزید کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس پر سوچیں گے اور پھر فیصلہ کریں گے، لیکن جب فیصلہ ہو گیا تو پھر ہم میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

وہ اگلی شام بذریعہ ریل گاڑی روانہ ہو گئی۔بعد دوپہر ہم دونوں نے گھر میں قیام کیا۔ ہم دونوں اکٹھے کھڑکی کے باہر گھورتے رہے، ہم نے ایک دوسرے کے پتے اپنے پاس درج کیے۔ہم نے یہ بھی طے کر لیا کہ ہر لکھے گئے خط کے ساتھ میں ایک جوابی لفافہ بھی ارسال کروں گا جس پر میرا پتہ درج ہوگا تاکہ اس کے خطوط یقینی طور پر مجھ تک پہنچ سکیں۔اس لیے اسے عربی رسم الخط میں لکھنا نہیں آتا تھا اور نہ حاروان میں ہمارا اڈا کیا لاطینی حروفِ تہجی پڑھ سکتا تھا۔

ایک گھنٹے تک ہم بے مقصد گفتگو میں مصروف رہے: اس برس موسم سرما کب تک جاری رہے گا، فروری کا اختتام ہے لیکن برف اب بھی کیوں موجود ہے۔تاہم، یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ وہ جلدی جلدی وقت گزارنا چاہتی تھی جبکہ میں ابھی تک اس مبہم امید سے جڑا ہوا تھا کہ ہم کچھ دیر مزید اکٹھے بیٹھ سکتے تھے۔

یہ بات میرے لیے حیران کن تھی کہ ہم دونوں کس طرح دنیاوی معاملات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔اس دوران ہم دونوں کے ہونٹوں پر پُراسرار قسم کی مسکراہٹ طاری ہوجاتی۔ جب بالآخر ریلوے سٹیشن جانے کا وقت آیا، ہم کچھ مطمئن سے ہو گئے۔اس کے بعد سے وقت جیسے پر لگا کر اڑ گیا۔وہ بضد تھی کہ ریل گاڑی کے ڈبے میں اس کا سامان رکھنے کے بعد میں اس کے ساتھ نہ بیٹھوں، اور ہم دونوں پلیٹ فارم پر ریل گاڑی کے چلنے کے منتظر رہیں گے۔ پھر ہم نے پلیٹ فارم پر بھی مزید بیس منٹ احمقانہ مسکراہٹوں کے ساتھ صرف کیےلیکن میرے نزدیک یہ عرصہ محض ایک ثانیے کے برابر تھا۔ ہزاروں خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔اس مختصر وقت میں ان کے ساتھ انصاف کرنا کسی بھی طرح ممکن نہ تھا، اس لیے میں نے کوشش بھی نہیں کی۔ میں دن بھر اپنے دل سے یہی سوال پوچھتا رہا کہ یہ الوداعی ملاقات اس قدر پھیکی اور بے کیف کیوں تھی؟

لیکن روانگی سے چند منٹ قبل ماریا خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں سمجھ گیا کہ جس چیز نے مجھے افسردہ کر دیا، یہ تھی کہ وہ روانگی سے قبل اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکی۔اس نے پہلے تو میرا ہاتھ تھامے رکھا اور کہا: ''یہ سب کچھ مضحکہ خیز ہے، کیا ایسا نہیں؟ تمہیں کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''لیکن جا تو تم رہی ہو۔ میں اب بھی یہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس نے میرا بازو ہلایا۔

''راعف...... میں اب جا رہی ہوں۔''

''ہاں...... مجھے علم ہے۔''

اب ریل گاڑی کی روانگی کا وقت تھا۔ کنڈکٹر نے ڈبے کا دروازہ بند کر دیا۔ ماریا پوڈر ایک قدم آگے بڑھی لیکن پھر وہ میرے جانب لپکی۔ بہت ہی مدھم آواز میں بولتے ہوئے لیکن ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے ہوئے اس نے کہا: ''میں جا رہی ہوں لیکن جب بھی تم مجھے بلاؤ گے، میں آ جاؤں گی۔''

پہلے تو مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اس سے اس کی کیا مراد تھی۔اس نے ایک لحہ توقف کے بعد

کہا: ''میں کہیں بھی جاسکتی ہوں!''

اب میں سمجھ گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ تھام کر انہیں چوم لوں۔لیکن ماریا پہلے ہی سوار ہو چکی تھی اور ریل گاڑی آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے کھڑکی میں دیکھتے ہی میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا لیکن پھر رک گیا۔ میں نے اپنی رفتار کم کر لی۔ اسے الوداع کہتے ہوئے میں نے بلند آواز سے کہا، ''میں تمہیں بلاؤں گا، تمہیں شک نہیں ہونا چاہیے...... میں تمہیں ضرور بلاؤں گا!''

اس نے سر ہلایا جب کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں اس کے تاثرات دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ اسے میری بات پر یقین تھا۔

مجھے گفتگو ادھوری رہ جانے کا بہت افسوس ہوا۔ ہم نے اس موضوع پر کل کیوں بات نہیں کی تھی؟ جب ہم اس کا سامان لے جا رہے تھے، ہم موسم سرما کے متعلق بات کر رہے تھے اور پھر ہمارے درمیان سفر سے لطف اندوز ہونے کے متعلق گفتگو شروع ہو گئی۔ کیا وجہ تھی کہ ہم نے ان تمام معاملات کو زیر گفتگو لانے سے گریز کیا جو ہمارے لیے بہت ہی اہم تھے؟ لیکن شاید یہی بہتر تھا۔ ان تمام الفاظ سے کیا حاصل ہوتا؟ کیا ہم اسی نتیجے پر نہ پہنچتے؟ ماریا نے بہترین طریقہ اختیار کیا کہ جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ اس میں میرے لیے پیشکش اور پھر اس کی تائید و تصدیق بھی تھی جس کا اظہار اس کی طرف سے بے اختیار ہوا تھا! اس سے زیادہ خوشگوار جدائی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ان تمام جذباتی الفاظ کو میں اپنے دل میں رکھتا...... وہ مجھے اس وقت کس قدر خوشنما اور نرم معلوم ہوتے تھے اور کس قدر نفیس بھی......!

اب مجھے ادراک ہونا شروع ہو گیا تھا کہ وہ میرے سامنے مجھ سے جدا کیوں ہو گئی۔ میرے جانے کے بعد اب اسے برلن کہیں زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا۔ میں نے اس سے پہلے برلن چھوڑنے کی بہت کوشش کی تھی، ٹکٹ، سفر کی تفصیلات و معلومات، ویزا، پاسپورٹ، میں نے دیوانہ وار کوشش کی تھی۔ اب مجھے یہاں کس قدر اجنبیت محسوس ہونے لگی تھی۔ جب بھی میں اس سڑک پر جاتا جہاں ہم اکٹھے پیدل چلتے تھے! حالاں کہ اس میں اداس ہونے کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ جب میں کافی مدت کے بعد اپنے معاملات کا انتظام کرنے ترکی پہنچ جاتا تو میں اسے خط لکھتا۔ میں اپنے

خوابوں کا کسی رکاوٹ کے بنا اظہار کر دیتا۔ میں اپنے تصور میں وہ خوبصورت اور شاندار قصر دیکھ سکتا تھا جو میں حاروان کے مضافات میں تعمیر کرتا اور پھر ہم دونوں اکٹھے پہاڑوں اور جنگلوں کی سیر کیا کرتے۔

چار روز بعد میں پولینڈ اور رومانیہ سے ہوتے ہوئے ترکی واپس آ گیا۔ اس سفر اور ترکی میں گزرے میرے باقی برسوں کے متعلق بتانے کو کوئی خاص بات نہیں...... جب میں کانسٹنٹا میں بحری جہاز پر سوار ہوا تو میں نے ان واقعات پر غور کرنا شروع کیا جن کے باعث مجھے ترکی واپس آنا پڑا تھا۔ بالآخر تمام سچائی میرے سامنے آ گئی: میرے والد فوت ہو گئے تھے اور اس امر سے مجھے بہت زیادہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ مجھے ان کی موت کا بہت بعد میں علم ہوا۔ درحقیقت کوئی حقیقی وجہ نہیں تھی کہ میں ان کے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کرتا؛ وہ ہمیشہ سے ہی میرے لیے اجنبی رہے تھے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ کیا میرے والد اچھے آدمی تھے، تو اس سوال کا جواب دینے کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ ایک حقیقی شخص کے طور پر ان کے متعلق سوچنا ہی مشکل تھا؛ میرے نزدیک وہ ہمیشہ سے ایک مبہم خیال تھے۔ ایک باپ، جس کا سر گنجا تھا، جس کی گول خاکستری ڈاڑھی تھی جو ہمیشہ ہر شام کو واپس گھر اس حالت میں آتا کہ اس پر غصہ طاری ہوتا۔ اس کے نزدیک کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے بچوں اور ان کی ماں کو خفیف سی توجہ بھی دیتا۔ وہ ان باپوں سے بہت مختلف تھا جو میں نے حوضولو کے کافی خانوں میں دیکھے تھے جو خوشگوار ماحول میں آریان پیتے تھے۔ میں اس قسم کے باپ کو کس طرح پسند کر سکتا تھا جو مجھے جب اس قسم کے باپوں کی صحبت میں دیکھتا تو وہ پہلے تو مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورتا اور پھر چلاّنے لگتا:

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ چولہے کے پاس جاؤ اور اپنے لیے شربت گرم کرو۔ پھر پچھواڑے ہمسایوں کے ہاں چلے جاؤ اور وہاں کھیلو۔''

حتیٰ کہ جب میں بڑا ہو گیا اور فوجی ملازمت سے فارغ ہو کر واپس بھی آ گیا، وہ مجھ سے اسی قسم کا سلوک کرتے۔ میں جس قدر اپنی نظروں میں بڑا ہوتا جاتا تھا، اس کی نظروں میں چھوٹا ہوتا جاتا تھا۔ اگر میں کبھی اپنے جذبات وخیالات کا اظہار اُن سے کرتا تو وہ میری طرف تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے۔ اگر بعد کے برسوں میں میری خواہشات کی طرف کچھ متوجہ ہوئے بھی اور مجھ

سے بحث وتکرار نہ کرتے تھے تو یہ بھی ان کی گھٹیا رائے کا ثبوت تھا۔

بہر حال، میرے ذہن میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی کہ میں اپنے ذہن کو ان کی یاد سے آلودہ کر لیتا۔ اس کی بے اعتنا موجودگی نہیں بلکہ اس کی غیر موجودگی مجھے زیادہ پسند تھی۔ بہر حال، حاوران جس قدر نزدیک آرہا تھا، میری افسردگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی موجودگی کے بغیر ہمارے گھر یا ہمارے شہر کا تصور بھی محال تھا۔

مجھے ضرورت نہیں کہ میں اس موضوع پر لکھتا جاؤں۔ بلاشبہ، میں ان دس برسوں کے متعلق کبھی بات نہ کرتا جو بعد ازں گزرے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں اس کے متعلق، اپنی زندگی کے بے کیف اور خالی ترین باب کے متعلق چند صفحات تحریر کروں تا کہ کچھ معاملات کی وضاحت ہو جائے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے انتہائی سرد مہر رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے بہنوئی کا سلوک مجھ سے انتہائی استہزائیہ تھا، میری بہنیں بھی مجھے اجنبی سمجھ رہی تھیں جبکہ میری والدہ تو بدتر حال میں تھیں۔ گھر خالی تھا، میری والدہ سب سے بڑے ماموں کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ چوں کہ وہاں مجھے کسی نے بھی رہنے کے لیے کہنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی، اس لیے میں اس بڑے گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو گیا۔ جب میں نے اپنے باپ کے کاروبار میں شریک ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو مجھے بتایا گیا کہ کاروبار تو ان کی وفات سے پہلے ہی تقسیم ہو چکا تھا۔ لیکن میں اپنے بہنوئی سے واضح طور پر معلوم نہ کر سکا کہ میرے لیے میرا باپ کیا چھوڑ کر گیا تھا۔ صابن کی دو فیکٹریوں کے متعلق تو کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا لیکن کچھ دیر مجھے معلوم ہو گیا کہ ان میں سے ایک فیکٹری کچھ عرصہ قبل میرے باپ نے فروخت کر دی تھی جبکہ دوسری فیکٹری میرے بہنوئی نے بیچ ڈالی تھی۔ بلاشبہ، یہ سب اس لیے ہوا تھا کیوں کہ میرا باپ اس تمام دولت اور سونے سے محروم ہو چکا تھا جس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ اس نے جمع کر کے رکھا ہوا ہے۔ میری والدہ کو کسی بھی چیز کا علم نہیں تھا اور جب میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب میں کہا: ''میرے بیٹے، مجھے کس طرح معلوم ہو گا؟ ہم تو بس یہی سمجھ سکتے تھے کہ تمہارا مرحوم باپ ہمیں یہ بتائے بغیر مر گیا کہ اس نے یہ سب کچھ کہاں دفن کیا تھا۔ تمہارے دونوں بہنوئی نے اس کے آخری ایام میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑا...... کیا اسے معلوم تھا کہ وہ مرنے والا تھا؟ بلاشبہ، اپنے آخری وقت میں اس نے انہیں

بتا دیا تھا کہ اس نے اپنی ہر چیز کہاں دفن کی تھی ...... اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم کم از کم خزانہ تلاش کرنے والوں سے بات کر سکتے تھے...... انہیں سب علم ہوتا ہے......''

اور سچ تو یہ تھا کہ میری والدہ، حاوران کے قرب و جوار میں موجود ہر اس شخص کے پاس گئیں جو خزانے کی تلاش کا ماہر تھا۔ ان کی تجویز پر ہم نے زیتون کے تقریباً ہر درخت کی جڑیں کھود ڈالیں اور علاقے کی ہر دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ جو جمع پونجی ان کے پاس بچ گئی تھی، وہ انہوں نے اس کام پر لگا دی۔ میری بہنیں بھی خزانے کی تلاش کے ماہر افراد کے پاس گئیں لیکن وہ اپنے طور پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ مجھے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ میرے بہنوئی ہماری اس تمام تگ و دو سے نہایت محظوظ ہو رہے تھے۔

فصل کا موسم آیا اور چلا بھی گیا، اس لیے زیتون کے باغات سے کوئی آمدن نہیں ہوئی۔ میں آئندہ فصل کے عوض کچھ رقم پیشگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ موسم گرما گزر جانے دوں اور جب بہار میں زیتون کا موسم آئے، اپنی بساط کے مطابق معاملات درست کر لوں جس کے بعد میں ماریا پوڈر کو فوراً بلوا سکتا تھا۔

ترکی واپس کے بعد ہمارے درمیان خط و کتابت مسلسل جاری تھی۔ ان اوقات، جن کے دوران میں اس کے خط پڑھتا یا ان کے جواب لکھتا، انہوں نے مجھے ان مشکل مسائل سے کچھ دیر کے لیے طمانیت فراہم کی جو مجھے بعد ازاں گرد آلود موسم بہار اور گھٹن زدہ موسم گرما میں پیش آئے۔ اس وقت مجھے گھر آئے ایک مہینہ ہو چکا تھا جب ماریا، اپنی والدہ کے ساتھ برلن واپس آ گئی۔ میں اپنے خطوط پوٹسڈم سکوئر کے ڈاک خانے بھجواتا اور وہ یہ خطوط وہاں سے لے لیتی۔ موسم گرما کے دوران مجھے اس کی طرف سے ایک عجیب سا خط ملا جس میں اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس میرے لیے چند اچھی خبریں تھیں اور وہ مجھے اس وقت بتائے گی جب وہ ترکی آئے گی۔ (اس وقت تک میں اسے بتا چکا تھا کہ میں اسے موسم خزاں میں ترکی بلا سکوں گا)۔ اور اگرچہ میں ہر خط میں اس سے استفسار کرتا تھا کہ میرے لیے خوش خبری کیا تھی، اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ اس نے محض یہ کہا تھا کہ ملاقات ہونے پر یہ خوش خبری معلوم ہو گی۔

لہٰذا، ہاں، میں نے نہ صرف موسم خزاں تک بلکہ طویل دس برس انتظار کیا...... اور پھر

تب ہی یہ خوشیاں بھری لہریں مجھ تک پہنچیں ...... میرے کہنے سے مراد یہ ہے کہ گزشتہ رات ......
لیکن فی الحال میں یہ بات آئندہ کے لیے چھوڑتا ہوں ۔ جیسے ہی کہانی منکشف ہوگی ، میں آپ کو بتاؤں گا ۔

اس موسم گرما میں بہت مصروف رہا ۔ زیتون کے باغات کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے گھوڑے پر سوار میں پہاڑوں میں گشت کرتا رہا ۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت صدمہ پہنچا تھا کہ میرے والد میرے لیے خشک ترین ، انتہائی بے فیض اور ناقابل رسائی قطعہ ہائے زمین چھوڑ گئے تھے ۔ جبکہ ہمارے شہر کے قریب واقع زرخیز زمینوں پر زیتون کے باغات ...... جہاں ہر درخت ، کم از کم نصف بوری زیتون مہیا کرتا تھا ، میری بڑی بہنوں ، یا یوں کہیے ، میرے بہنوئیوں کے لیے چھوڑ دی گئی تھیں ۔ میرے حصے میں آنے والے زیادہ تر باغات کی درختوں کی تراش خراش بھی برسوں سے نہیں کی گئی تھی اور وہ جھاڑ جھنکار میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے ۔ جلد ہی مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے والد کے زمانے میں کسی نے وہاں جانے اور کاشت کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی ۔

اپنے والد کی علالت ، اپنی بہنوں کی مضطرب کیفیت اور اپنی والدہ کی اذیت پر غور کرتے ہوئے میں محض یہی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ میری عدم موجودگی میں کوئی سازش کی گئی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ میں انتہائی محنت و مشقت کرتے ہوئے اپنے معاملات درست کرلوں گا ۔ ماریا کا ہر خط اس ضمن میں میری ہمت بندھاتا اور میری حوصلہ افزائی کرتا ۔

اکتوبر شروع ہونے پر ، جب زیتون پکنے کا آغاز ہوا ، اور میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ میں اپنی محبوبہ کو یہاں بلاؤں ، یکایک خطوط آنا بند ہو گئے ۔ اس وقت تک میں نے اپنے گھر کی تزئین و آرائش کے لیے استنبول سے نیا فرنیچر مع باتھ ٹب منگوانے کے لیے کہہ دیا تھا جس کے لیے میں نے پرانے غسل خانے میں نئی ٹائلیں لگوائی تھیں اور یہ سب کچھ حاوران کے لوگوں کے علاوہ خاص طور پر میرے افرادِ خانہ کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھا اور باعث حقارت تھا ۔

میں نے مناسب نہ سمجھا تھا کہ کسی کو میں اس کی وجہ بھی بتاؤں ، اس لیے انہوں نے مجھے شیخی خورا اور گھمنڈی شخص سمجھتے ہوئے میرے بارے میں طرح طرح کی طنزیہ باتیں کرنا شروع کر دیں ۔ بلاشبہ ، یہ سب کچھ کسی ایسے شخص کی طرف محض پاگل پن کا اظہار تھا جو میرے جیسا تنگ

دست تھا اور جس نے زیتون کی کاشت کے لیے رقم بھی ادھار لی تھی کہ وہ غسل خانے میں شیشے کی الماریوں پر رقم خرچ کرے لیکن میں نے مسکراتے ہوئے یہ تمام الزامات برداشت کیے۔ بہر حال، انہیں یہ سمجھ آ ہی نہیں سکتی تھی کہ میرا مقصد کیا تھا اور نہ ہی میں مجبور تھا کہ انہیں وضاحتیں پیش کروں۔

لیکن ماریا کی طرف سے خط آنا بند ہونے میں بیس دن ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہونے لگا۔ جس طرح ہمیشہ سے ہی شکوک وشبہات مجھ پر بہت جلد وارد ہو جاتے تھے، اس دفعہ میرے ذہن میں ہزاروں امکانات نے سر ابھارا۔ اس کی خاموشی کی ہزاروں وجوہ میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ میں اسے خط پر خط لکھتا رہا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا جس کے باعث مجھ پر مایوسی اور افسردگی طاری ہوگئی۔ میرے لیے یہ بات بھی حیران کن تھی کہ اس کی طرف سے خطوط آنے بند ہونے سے پہلے، خط کم کم آنے لگے تھے...... میں نے اس کے تمام خطوط نکالے اور انہیں دوبارہ پڑھا۔ حالیہ مہینوں میں اس کی طرف سے مبہم بلکہ پہلو تہی پر مشتمل کچھ جملے میری نظروں سے گزرے جو میری نظر میں ایسی عورت کی طرف سے قطعی غیر متوقع تھے جو کھلے دل و دماغ کی مالک تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو، کوئی ایسی چیز جس کے لیے وہ تیار نہ ہو۔ اس لیے میں نے خود سے یہ استفسار کرنا شروع کر دیا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ نہیں چاہتی کہ میں اسے ترکی بلاؤں...... یا پھر اپنے وعدے توڑنے سے ڈرتی ہو کہ پھر میں بھی ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اب میں اس کے ہر خط کی ایک ایک سطر پڑھ رہا تھا جس میں ہر مذاق اور نا تمام خیال پر میری توجہ بٹ جاتی تھی۔

میرے خطوط بے کار ثابت ہوئے۔ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے۔

اس کے بعد سے مجھے ماریا پوڈر کا کوئی خط نہیں ملا...... اس کا میں نے نام تک نہیں سنا...... لیکن کل...... میں اچھل پڑا تھا...... ایک ماہ بعد میرا آخری خط اس مہر کے ساتھ واپس آ گیا کہ ''مکتوب الیہ موجود نہیں، مرسل کو واپس بھیجا جائے۔'' یوں میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ آج بھی جب میں یہ بات یاد کرتا ہوں کہ میں اگلے چند روز میں کس قدر تبدیل ہو چکا تھا، مجھے بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ اس وقت مجھ میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ میں کسی بھی قسم کی نقل و

حرکت کرسکتا، دیکھ سکتا یا سوچ سکتا کہ کس چیز نے مجھے ہمت وطاقت بخشی کہ میں زندہ تو رہوں لیکن صرف میرا سایہ ہی نظر آئے۔

اب میری شخصیت وہ نہیں رہی تھی جو نئے سال کے ابتدائی ایام میں نظر آتی تھی۔ میں خودکو اس وقت قطعی خالی الذہن محسوس کرنے لگا تھا لیکن اس کیفیت کا تقابل اس ویرانئ دل سے نہیں کیا جاسکتا تھا جو اس وقت مجھ پر طاری تھی کیوں کہ میں ایک ایسا خوش کن خواب دیکھ رہا تھا کہ شاید ہم دونوں کے درمیان ایک دفعہ پھر پرانی آشنائی پیدا ہو جائے ،اس کا ذہن تبدیل ہوجائے۔لیکن اب میں قطعی مایوس اور افسردہ ہو چکا تھا۔ ہمارے درمیان اس قدر فاصلے سے مراد یہ تھی کہ اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے خودکو اپنے گھر میں بند کرلیا، ایک اور کبھی دوسرے کمرے میں جاتا، اس کے خطوط پڑھتا اور وہ خطوط بھی پڑھتا جو مجھے واپس آئے تھے۔ میں ان نکات پر غور کرنے لگا تھا جنہیں میں اب تک سمجھنے سے قاصر رہا تھا، اور اب میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ موجود تھی۔

میں نے کسی بھی کام بلکہ زندگی پر بھی توجہ دینی چھوڑ دی تھی۔ بلاشبہ، زندگی میں میرے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ میں زیتون کے درخت کی ٹہنیاں ہلانا چھوڑ دیں، ان کے پھلوں سے تیل کشید کرنے کی خاطر انہیں فیکٹری لے جانا چھوڑ دیا۔بعض اوقات میں اپنے جوتے پہنتا اور مضافات کی طرف نکل پڑتا جہاں میں کسی ذی روح کا سامنا ہونے کے خطرے کے بغیر گھومتا پھرتا۔ رات گئے میں واپس گھر آتا، دیوان پر لیٹ کر چند گھنٹے کی نیند لیتا۔صبح اٹھ کر دردِ دل لیے نکل کھڑا ہوتا اور حیران ہوتا کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔

اور یوں ناگزیر طور پر یہی نتیجہ نکلا کہ میں نے ایک دفعہ پھر وہی زندگی اختیار کر لی جو ماریا پوڈر سے ملاقات سے پہلے گزار رہا تھا۔ اب پہلے کی طرح میرے ایام بے کیف اور بے زار گزرنے لگے بلکہ یہ دن مزید اذیت ناک ہو گئے تھے۔ اپنی بے خبری میں میرا خیال تھا کہ اس سے زیادہ زندگی میں کچھ باقی نہیں تھا۔ میں اب تکلیف اٹھا رہا تھا کیوں کہ اب مجھے ادراک تھا کہ زندگی بسر کرنے کا ایک راستہ اور بھی تھا۔ اب مجھے اپنے ماحول کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ زندگی کی خوشیوں نے مجھ پر اپنے دروازے بند کر لیے تھے۔

ایک خاتون نے وقتی طور پر مجھے بے کیف اور بے زار کاہلی سے باہر کھینچ لیا تھا؛ اس نے مجھے سکھایا کہ میں ایک مرد ہوں، بلکہ میں ایک انسان ہوں؛ اس نے مجھے یہ بھی دیکھا دیا تھا کہ دنیا اس قدر بے کیف اور خالی نہیں جس طرح میں پہلے سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ مجھ میں خوشیوں سے لطف اندوز کی صلاحیت موجود تھی۔ مگر جس لمحے ہم آخری بار ملے تھے، میں اس کی ہمت افزائی سے محروم ہو گیا۔ میں دوبارہ اپنے پرانے ڈھب پر واپس آ گیا۔ اب مجھے ادراک ہو چکا تھا کہ مجھے اس کی کس قدر شدید ضرورت تھی۔ میں اس قسم کا شخص نہیں تھا جو زندگی کے راستے پر تنہا چل سکے، مجھے اس کا ساتھ چاہیے تھا۔ میں اس کی معاونت کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر میں زندگی کرنے لگا...... جس طرح سب دیکھ رہے ہیں...... کہ اگر اسے زندگی کہا جائے......

پھر میں اپنی پرانی روش کی طرف واپس پلٹ گیا......

میں نے پھر کبھی ماریا کا نام نہیں سنا۔ میں نے پنشن کو بھی خط لکھا لیکن اس کی منتظمہ نے مجھے لکھ بھیجا کہ فاؤ وین ٹیڈ مین اب یہاں نہیں رہتی اور اس نے اپنا کوئی پتہ بھی نہیں دیا۔ میں اب کس سے استفسار کر سکتا تھا؟ اپنے ایک خط میں ماریا پوڈر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اور اس کی ماں پراگ سے واپس آنے کے بعد اپنے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن مجھے اس گھر کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ جب میں نے ان چند لوگوں کے متعلق سوچنا شروع کیا جو جرمنی میں میرے دو برس قیام کے دوران میرے واقف بن گئے تھے، مجھے حقیقی صدمہ پہنچا۔ میں کبھی بھی برلن سے دور نہیں گیا تھا لیکن میں نے تو اس کی ہر سڑک، عجائب گھر، تصویر گھر، نباتاتی باغ، جنگلات، جھیلیں اور چڑیا گھر تک دیکھ لیے تھے لیکن لاکھوں افراد کے اس شہر میں، میں نے چند ہی لوگوں سے بات کی تھی اور ان سے میری حقیقی آشنائی ہوئی تھی۔

شاید مجھے بس وہی درکار تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہی وجہ تھی کہ ہم سب کو چاہیے: ایک شخص۔ لیکن اس وقت کیا کیا جائے جب وہی واقعی وہاں موجود نہ ہو؟ لیکن اس وقت کیا کیا جائے جب یہ سب کچھ ایک خواب ثابت ہو، جب یہ سب کچھ وہم ثابت ہو؟ امید کی کرن سے میں محروم ہو چکا تھا جبکہ اس کے ساتھ میں یقین کرنے کی قوت سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ دوسروں پر میرے عدم بھروسے میں اضافہ ہو چکا تھا، لوگوں سے میرا اعتبار اٹھ چکا تھا اور اس سے بھی تلخ حقیقت کہ

بعض اوقات میں اپنے آپ سے بھی ڈر جاتا۔ جس سے بھی میں ملتا، میں نفرت کے عالم میں ملتا۔ جس سے بھی میرا سامنا ہوتا، اسے میں عداوت اور کینے کی نظر سے دیکھتا۔ وقت گزرنے کے باوجود یہ رویہ نرم نہ ہوسکا بلکہ سال بہ سال یہ رویہ بڑھتا گیا۔ لوگوں کے خلاف میرا عدم اعتماد اب نفرت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جو مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرتے۔ مجھے ان لوگوں سے شدید خوف آتا جنہیں میں خود سے بہت قریب سمجھتا۔ میں خود کلامی کرتا، ''اس کے بعد نہیں، جو اس نے میرے ساتھ کیا تھا......'' لیکن اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا...... مجھے معلوم نہیں، اور یہی وجہ تھی کہ میرے تصورات انتہائی سنگین اور خوفناک امکانات پر مبنی تھے۔ یہی کچھ تو اس دنیا کا وتیرہ تھا...... اور پھر اس بے ساختہ وعدہ پورا کرنے کی کیا ضرورت تھی جو جدائی کے وقت کیا گیا تھا؟ کہیں بہتر تھا کہ تب ہی اور وہیں، بغیر کسی جھگڑے کے، تعلقات قطع کر لیے جاتے۔ میرے خطوط ڈاک خانے میں جمع ہوتے گئے، جن کا مجھے کبھی جواب نہیں آتا تھا...... اور اب میرا خیال تھا کہ ہر چیز ختم ہو چکی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کون سی نئی مہم جوئی نے اس کی توجہ بٹا لی تھی؟ کون جان سکتا تھا کہ اس نے کسی اور مرد کی بانہوں میں ایک نئی اور کہیں زیادہ خوشی اور انسیت تلاش کر لی تھی؟ ان سب سے قطع نظر، محض اس لیے کہ اس نے ایک معصوم دل جیتنے کا وعدہ کیا تھا، زندگی میں اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنے کا وعدہ کیا تھا جس کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی...... اور بعد میں اسے ہوش آ گیا تھا......

لیکن کیوں اپنے تمام جائز خیالات کے باوجود، کیا میں نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے قابل نہیں تھا؟ اب میں ہر اس نئے موقع سے کیوں فائدہ نہ اٹھاتا جو مجھے حاصل ہوتا تھا؟ یہ کیوں تھا کہ جب بھی کوئی مجھ سے بہت قریب ہونے کی کوشش کرتا، سب سے پہلے مجھے یہی خیال آتا کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا؟ ایسے بھی مواقع آتے جب میں خود کو بھی فراموش کر دیتا اور کسی کو اپنے قریب آنے کا موقع دیتا لیکن پھر مجھے کوئی آواز کسی متوقع خطرے سے آگاہ کرتی کہ میں سیدھے راستے پر چلوں: ''مت بھولو، مت بھولو! مت بھولو کہ وہ اس سے بھی زیادہ تم سے قریب تھی...... لیکن اس کے باوجود وہ تمہیں چھوڑ گئی......'' اگر کوئی مجھ سے بہت قریب ہوتا کہ میری امیدیں جاگ اٹھتیں، میں انہیں فوراً ہی دفنا دیتا: ''نہیں، نہیں، وہ بھی تو مجھ سے

قریب تھی...... اور اب ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں...... ہاں ایسا ہی ہوتا ہے!'' یقین کریں یا نہ کریں...... ہر دن...... دن کے ہر لمحہ...... یہی سوال مجھے دہشت زدہ کرتا۔ میں جس قدر زیادہ کوشش کرتا، میں اس سوال کی گرفت سے چھٹکارا نہ پا سکتا...... میری شادی بھی ہوگئی...... شادی کے دن بھی مجھے معلوم تھا کہ میری بیوی دنیا میں کسی بھی شخص کی نسبت مجھ سے کہیں زیادہ فاصلے پر تھی...... ہمارے بچے بھی ہوئے...... مجھے ان سے محبت تھی لیکن مجھے ہمیشہ یہ علم رہا کہ وہ مجھے وہ سب کچھ لوٹا نہیں سکتے جو میں لٹا چکا تھا......

مجھے کسی کام سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں نے مشین کی مانند کام کیا تھا لیکن مجھے بالکل بھی خبر نہیں تھی کہ میں کیا کر رہا تھا۔ جب مجھے دوسرے دھوکا دیتے، مجھے عجیب سے خوشی محسوس ہوتی۔ میرے بہنوئی مجھے بے وقوف بناتے لیکن میں قطعی برا نہ مانتا۔ شادی کے اخراجات اور قرضے ادا کرنے کے بعد میرے پاس کون سی جائیداد باقی بچی تھی۔ زیتون کے باغات بہت کم قیمت کے حامل تھے۔ ایک لاوارث جائیداد کی حیثیت سے کوئی بھی خریدار ان سے دولت نہیں کما سکتا تھا بلکہ کوئی بھی ایسا خریدار نہ تھا کہ جو زیتون کے تنے یا درخت کے لیے نصف لیرا بھی ادا کرنے پر رضامند ہوتا جس سے کاشت کاری کے موسم میں محض سات یا آٹھ لیرا مالیت کی سالانہ پیداوار حاصل ہوتی۔ سنگین نتائج اور خاندان کی دولت ضائع ہونے سے بچانے کی خاطر ہی میرے بہنوئی میرے قرضے ادا کرنے کے علاوہ زیتون کی پیداوار بھی خرید لیتے۔ میرے پاس ایک تباہ حال مکان کے سوا کچھ نہ بچا تھا جس کے پندرہ کمرے تھے جبکہ یہاں نام کا کچھ فرنیچر بھی موجود تھا۔ میری بیوی کے والد ابھی حیات تھے اور بالیکسر میں ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کی مدد سے صوبائی حکومت کی ایک فرم میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں بہت برس قیام کیا۔ جوں جوں میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا گیا، میں دنیا سے کہیں زیادہ الگ تھلگ ہوتا گیا کیوں کہ میں کسی سے رابطہ کرنے کی قطعی خواہش کھو چکا تھا۔ پھر میرے سسر وفات پا گئے اور میں اپنی بیوی کے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ رہ گیا لیکن اپنی چالیس لیرا کی تنخواہ کے ساتھ میں ان کی مالی معاونت کرنے سے قاصر تھا۔ اس لیے میری بیوی کے ایک دور کے رشتہ دار نے انقرہ کی ایک فرم میں میرے لیے ملازمت کا

انتظام کیا جہاں میں آج بھی کام کر رہا ہوں۔ اگر چہ میں کچھ کہنے کے قابل نہیں تھا کہ لیکن مجھے امید تھی کہ میں غیر ملکی زبان کے بل بوتے پر اس فرم میں بہت جلدی ترقی کروں گا لیکن اس قسم کی کوئی صورتِ حال پیش نہیں آئی۔ قطع نظر اس کے کہ میں کہاں تھا، میں اپنی موجودگی ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ مواقع بہت سے تھے۔ بہت سے لوگوں نے مجھے بہت امید دلائی تھی کہ میں اپنے دل میں پوشیدہ بہت سی خواہشات کے بل بوتے پر جلد ہی ترقی کرلوں گا لیکن میں اپنے خبطی پن سے نجات حاصل نہ کرسکا۔ تاہم، اس وقت صرف ایک ہی شخص تھا جس پر مجھے یقین تھا۔ مجھے اس پر اس قدر گہرا یقین تھا...... کہ ایک دفعہ اس سے دھوکا کھانے کے بعد...... میں ایک دفعہ پھر کسی دوسرے شخص پر یقین کرنے کی خواہش کھو چکا تھا۔ مجھے اس پر کوئی غصہ نہیں تھا۔ میں اس سے کوئی پرخاش رکھ ہی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی میں اس سے رنجیدہ تھا بلکہ میں تو اس قسم کی کوئی بات اس کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اب تو اس دنیا کے ہر شخص سے مجھے پرخاش اور رنجیدگی محسوس ہوتی تھی؛ کیوں کہ وہ میرے نزدیک انسانیت کا نمونہ تھی۔ جیسے جیسے برس گزرتے گئے، میرا تعلق اس سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتا گیا اور میں خود کو دنیا سے کہیں زیادہ مزید الگ تھلگ محسوس کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بہت پہلے مجھے فراموش کر چکی تھی۔ کون جانتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھی یا کس کے ساتھ وہ اپنا وقت گزار رہی تھی؟ شام کو جب میں اپنے بچوں کے شکوے اور شکایتیں سن رہا ہوتا، میرے سسرالی توں توں میں میں کرتے، میری بیوی سلیپر پہنے باورچی خانے میں سڑپ سڑپ چلتی ہوتی اور رکابیوں کا شور سنائی دیتا، میں اپنی آنکھیں بند کرلیتا اور ماریا پوڈر کا تصور کرتا جو دنیا میں کسی جگہ موجود تھی۔ شاید، اس وقت وہ اپنے ایک ہم خیال دوست کے ساتھ نباتاتی باغ کی سیر اور درختوں کے سرخ پتوں کی تعریف کر رہی ہوگی۔ شاید وہ اور اس کا ہم خیال دوست کے ساتھ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں نیم تاریک گیلری میں گھوم پھر کر عظیم مصوروں کی تعریف کر رہی ہوگی۔ ایک شام میں کچھ چیزیں لینے کے لیے ایک مقامی دکان پر گیا اور جیسے ہی میں باہر نکلا، میں نے ریڈیو پر ایک نوجوان گلوکار کی آواز میں Weber کے Oberon کی دھن سنی جو ہم سے بہت دور کسی ملک میں بج رہی تھی۔ یہ سنتے ہی میرے ہاتھ سے چیزیں گرتے گرتے بچیں۔ یہ اوپیرا میں نے ماریا کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے خاص طور پر Weber بہت پسند تھا۔ جب ہم کہیں باہر چہل قدمی

کرر ہے ہوتے، وہ ہمیشہ اپنے ہونٹوں سے یہی دھن بجاتی ہوتی۔ اس وقت مجھے یوں اس کی یاد آ گئی جیسے کہ ہم کل ہی جدا ہوئے ہوں۔ کسی قیمتی چیز کو کھونے کا دکھ...... خواہ یہ دنیاوی خوشی ہو یا مادی دولت ہو...... کو وقت گزرنے کے ساتھ بھلایا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مواقع جو ہم سے چھوٹ چکے، ہمیں کبھی نہیں بھولتے اور جب بھی وہ ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے ہم پر وارد ہوتے ہیں، ہمیں دکھ اور تکلیف ہوتی ہے۔ یا شاید جو چیز ہمیں خوف زدہ کرتی ہے، یہ ہے کہ حالات مختلف ہو سکتے تھے۔ چوں کہ اس خیال کے بغیر ہم قسمت کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے اور اسے تسلیم کر لیں گے۔

اس ضمن میں مجھے اپنی بیوی یا میرے بچوں...... یا پھر میرے خاندان کی طرف سے بہت زیادہ توجہ نہیں ملی۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ مجھے بھی یہی توقع تھی۔ بے وقعتی کا وہ خول، جو برلن میں نئے سال کے پہلے عجیب سے دن مجھ پر طاری ہو گیا تھا...... اب میری کھال بن چکا تھا۔ میں ان لوگوں کے کس کام کا تھا کہ محض وہ ریز گاری مہیا کر سکوں جو انہیں روٹی خریدنے کے لیے درکار ہوتی؟ ہم دولت اور مادی مفاد کی نسبت جو چیز لوگوں سے حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، وہ محبت اور توجہ ہے۔ خاندان والا فرد جسے ان میں سے کوئی بھی چیز بھی حاصل نہیں ہوتی، ہرگز کوئی خاندانی آدمی نہیں؛ کیوں کہ وہ تو محض اجنبیوں کے سروں پر چھت دے رہا ہوتا ہے۔ مجھے کس قدر شدت کے ساتھ اس دن کا انتظار تھا جب انہیں میری مزید ضرورت نہ ہو گی اور یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا! وقت گزرنے کے ساتھ میری زندگی اسی دُور افتادہ امید کی بنیاد پر متشکل ہو گئی۔ میں تقریباً ایک مجرم کی طرح زندگی گزارنے لگا جو ہر روز اپنے زندگی گھسیٹتے ہوئے جیتا ہے۔ اگر میں بھی ان گزرتے ہوئے دنوں کو اہم سمجھتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی کہ یہ عمل مجھے اپنے انجام سے مزید قریب کر دیتا۔ میں کسی ایسے پودے کی مانند زندگی بسر کر رہا تھا، جو بے شعور اور بے شکایت ہوتا ہے، جس کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ کسی بھی قسم کا جذبہ میرے اندر موجود نہیں تھا۔ خوشی و غم، میرے لیے معانی کھو چکے تھے۔

میں لوگوں کے لیے اپنے دل میں کس طرح ناراضی محسوس کر سکتا تھا؟ ایک ایسا شخص جسے میں بہت ہی قیمتی، شاندار اور محبوب سمجھتا تھا، نے مجھے قاتل قسمت کے حوالے کر دیا تھا، اس

لیے میں دوسروں سے کس طرح کسی چیز کی توقع کرسکتا تھا؟ اب میں کسی سے محبت کرنے کا مزید متحمل نہیں ہوسکتا تھا یا کسی سے دوستی کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیوں کہ اس شخص نے مجھے دھوکا دیا تھا جس پر میں بہت زیادہ بھروسا اور اعتماد کرتا تھا۔ اور پھر یوں میں کسی دوسرے پر دوبارہ کس طرح بھروسا کرسکتا تھا؟

جب کبھی میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچتا، میں اکتاہٹ اور بے زاری کا تصور کرتا اور بالآخر میں اس دن کی حسرت میں مبتلا ہوجاتا جب سب کچھ ختم ہوجاتا تھا۔ مجھے اب مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی اور بہتر یہی تھا کہ میں خود یا کسی دوسرے کو موردِ الزام نہ ٹھہراؤں۔ قسمت نے میرے ساتھ برا سلوک کیا تھا لیکن بہرحال، بلاشبہ، میں خود یا کسی دوسرے کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا...... بہتر یہی تھا کہ اس صورتِ حال کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے کہ سب اسی طرح رہے گا اور اسے بس برداشت کرنے کی راہ تلاش کی جائے۔ مجھے اب اپنی زندگی بیزار کن معلوم ہونے لگی تھی اور بس...... اب مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

پھر ایک روز...... اگر زیادہ صحیح طور پر کہا جائے تو کل...... بروز ہفتہ...... میں گھر آیا اور لباس تبدیل کیا۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ گھر کے لیے چند اشیا درکار ہیں: ''کل دکانیں بند ہیں، اس لیے تمھیں بازار کا ایک اور چکر لگانا پڑے گا!'' بادل نخواستہ، میں نے دوبارہ لباس تبدیل کیا اور مچھلی منڈی کی طرف چل دیا۔ اس روز بہت گرمی تھی۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمدورفت بہت زیادہ تھی جو گرد و غبار سے نجات حاصل کرنے کی خاطر شام کی ٹھنڈک کے منتظر تھے۔ میں نے اپنی خریداری مکمل کرلی اور سامان کا لفافہ اپنی بغل میں دابے مجسمے کی جانب چلنے لگا۔ میں نے بل کھاتی عقبی گلیوں کی بجائے پکی سڑکوں کے راستے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا، حالاں کہ یہ راستہ کچھ لمبا تھا۔ ایک دکان کے باہر معلق بڑا سا گھڑیال چھے بجا رہا تھا۔ اچانک کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

ایک خاتون نے اپنی گونج دار آواز میں کہا: ''ہیر راعف......!''

میں یہ سن کر ششدر رہ گیا کہ کوئی خاتون مجھے جرمن زبان میں مخاطب کر رہی تھی! میں نے فوراً بھاگنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس خاتون نے مجھ پر اپنی گرفت مضبوط کردی۔

''نہیں، مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ واقعی یہ تم ہو، راعف صاحب! یا خدایا!'' وہ اس قدر

زور سے بولی کہ راہگیر بھی حیران ہو گئے۔ ''کیا کوئی شخص واقعی اس قدر بدل سکتا ہے؟''

آہستہ آہستہ میں نے اپنا سر اٹھایا۔ اگرچہ میں اس کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا، مجھے اس کی آواز اور بھاری بھر کم جسم سے پتا چل گیا تھا کہ وہ کون تھی۔

''آہ، فاؤوین ٹیڈ مین، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم سے یوں انقرہ میں ملاقات ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''فاؤوین ٹیڈ مین نہیں، فاؤڈ وپکے، میں نے شوہر کے لیے 'وین' قربان کر دیا۔ لیکن پھر بھی میں ٹھیک ہوں!''

''مبارک ہو...... تمہیں......''

''ہاں، ہاں، جس طرح تم تصور کر سکتے ہو...... جیسے ہی تم ترکی واپس لوٹے، اس سے کچھ دیر بعد ہم نے پنشن چھوڑ دیا...... قدرتی طور پر ساتھ...... ہم پراگ چلے گئے......''

پراگ کا ذکر سننے پر جیسے کوئی چاقو میرے دل میں تیر ہو گیا۔ اب اس کا خیال ضبط کرنا ناممکن تھا۔ لیکن اب میں کس طرح اس سے ماریا کے متعلق پوچھ سکتا تھا؟ اسے ماریا کے ساتھ میرے تعلق کا علم نہیں تھا۔ اگر میں اس کے متعلق پوچھتا، تو یہ خاتون کیا سوچتی؟ اور پھر، وہ مجھ سے نہ پوچھتی کہ ماریا سے میرا کیا تعلق تھا؟ وہ مزید کیا کہتی؟ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اسے علم بھی نہ ہو؟ بہت برس...... دس برس...... بلکہ زیادہ...... گزر چکے تھے۔ کیا فائدہ تھا کہ اسے یہ تمام قصہ معلوم ہو؟

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ہم ابھی تک سڑک کے بیچ میں کھڑے تھے، میں نے کہا: ''آؤ، ہم کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمیں بہت سی باتیں کرنا ہیں...... میں ابھی تک اس حیرت سے نہیں نکل سکا جو مجھے تمہیں انقرہ میں دیکھ کر ہوئی۔''

''ہاں ٹھیک ہے کہ کسی جگہ کچھ دیر کے لیے بیٹھ جائیں لیکن ہماری گاڑی محض نصف گھنٹے سے کم وقت میں روانہ ہو جائے گی...... ہمیں یہ ریل گاڑی ضرور پکڑنی ہے...... اگر مجھے علم ہوتا کہ تم انقرہ میں کہاں رہتے ہو تو میں ضرور تمہیں فون کرتی۔ ہم گزشتہ رات ہی پہنچے ہیں اور ہم آج رات واپس جا رہے ہیں......''

اور پھر میں نے دیکھا کہ اس کے عقب میں زرد چہرے والی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس

کی عمر آٹھ نو برس ہوگی۔ میں اسے دیکھ کر مسکرایا: ''کیا یہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''نہیں، میری ایک عزیز ہے...... میرا بیٹا تو قانون کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔''

''کیا تم ابھی تک اسے کتابیں پڑھنے کے لیے دیتی ہو؟''

لمحہ بھر کے لیے وہ کچھ الجھی سی معلوم ہونے لگی اور پھر اسے یاد آ گیا اور وہ مسکرا دی: ''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو لیکن جو کتابیں میں اسے پڑھنے کے لیے کہتی ہوں، وہ ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا۔ وہ تو تب بہت چھوٹا تھا...... بارہ یا اس سے کچھ زیادہ...... اوہ، میرے خدا...... وقت کس قدر تیزی سے گزر رہا ہے!''

''ہاں...... لیکن تم تو پہلے جیسی ہو!''

''اور تم بھی کچھ نہیں بدلے!''

اس کے پہلے کہے ہوئے الفاظ زیادہ سچ تھے لیکن میں نے ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔

ہم ڈھلان سے اترتے چلے گئے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں اس سے ماریا پوڈر کے متعلق کیسے پوچھوں، اس لیے میں ان معاملات کے متعلق اس سے گفتگو کرتا رہا جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا کہ تم انقرہ کیسے آئیں؟''

''اوہ، اچھا، میں تمہیں بتاتی ہوں...... ہم تو محض گزر رہے تھے...... اور ہمیں ایک رات یہاں قیام کرنا تھا۔''

وہ لیمونیڈ کے ایک خوانچے کے پاس پانچ منٹ بیٹھنے کو تیار ہوگئی جہاں اس نے اپنا قصہ جاری رکھا۔

''میرا خاوند اس وقت بغداد میں ہے...... تمہیں علم ہی ہے کہ وہ مقبوضہ نو آبادیوں میں تجارت کرتا ہے۔''

''لیکن بغداد تو جرمنی کی مقبوضہ نو آبادی نہیں!''

''اوہ، مجھے اس بارے میں معلوم ہے...... لیکن میرے خاوند کو گرم ممالک کی اشیائے

خوردنی کی تجارت کا بہت تجربہ ہے۔اس وقت وہ کھجوروں کی تجارت کا ایک معاہدہ طے کرنے کی خاطر بغداد گیا ہے!''

''کیا وہ کیمرون میں بھی کھجوروں کی تجارت کرتا تھا؟''

اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ بے وقوف مت بنو۔

''مجھے نہیں معلوم، تم اسے خط لکھ کر خود کیوں نہیں معلوم کر لیتے۔وہ نہیں چاہتا کہ خواتین اس کے کاروبار میں دخل دیں۔''

''تو تم اس وقت کہاں جا رہی ہو؟''

''برلن......ہم دونوں اپنے وطن جا رہے ہیں۔''اس نے اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کیا اور کہا،''اور اس بچی کی خاطر...... یہ بہت کمزور ہے،اس لیے موسم سرما کے لیے اسے اپنے ساتھ لے آئے،اب میں اسے اس کے گھر چھوڑنے جا رہی ہوں۔''

''اچھا تو تم اکثر برلن جاتی ہو؟''

''سال میں دو مرتبہ۔''

''یوں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ڈوپکے صاحب کا کاروبار اچھا جا رہا ہے؟''

وہ مسکرا دی اور فلرٹ کے انداز میں کسمسائی۔

ابھی تک میں اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔اب، مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میری اس ہچکچاہٹ کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اس سے کیسے پوچھوں بلکہ محض اس لیے کہ خدا جانے مجھے اس کے متعلق کیا معلوم ہو۔لیکن کیا میں پہلے ہی اپنی قسمت پر شاکر نہیں ہو چکا تھا؟ میں ہر قسم کے جذبے سے محروم ہو چکا تھا، پھر میں خوف زدہ کیوں تھا؟ ممکن ہے کہ ماریا نے اپنا کوئی ڈوپکے صاحب تلاش کر لیا ہو۔شاید وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہو اور کسی بہتر سے بہتر مرد کی تلاش میں ہو جس پر وہ یقین کر سکے۔زیادہ امکان تو یہ تھا کہ اب وہ میرا چہرہ بھی نہ پہچانتی۔

لیکن جب میں نے اس کے متعلق سوچا، میں اس کا چہرہ بھی ذہن میں نہیں لا سکا، اور گزشتہ دس برس کے دوران پہلی مرتبہ مجھے ادراک ہوا کہ ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کی کوئی تصویر بھی نہیں...... کس قدر عجیب بات تھی! ہم نے ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے اس

کے متعلق کیوں نہیں سوچا تھا؟ یقیناً اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا خیال تھا کہ ہم جلد ہی آن ملیں گے اور ہمیں اپنی قوتِ یادداشت پر بھروسا تھا لیکن کیا وجہ تھی کہ اس ضمن میں مجھے ابھی تک کوئی خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ کیا میں نے اس کا چہرہ اپنے تصور میں لانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تھی؟

مجھے یاد آیا کہ کسی زمانے میں مجھے اس کے چہرے کی ایک ایک لکیر سے آشنائی تھی......اور میں کس طرح ابتدائی مہینوں نے کسی بھی مشکل کے بغیر اس کا تصور کر سکتا تھا......

بعدازاں...... جب مجھے ادراک ہو گیا تو اب تو سب کچھ ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے تو کبھی اسے دیکھنے یا پھر اس کا تصور کرنے کی کوشش بھی نہ کی تھی کیوں کہ مجھے علم تھا کہ میں اس کا تصور کر ہی نہیں سکوں گا۔ فرکوٹ والی میڈونا کے چہرے کا ایک لحظے بھر کا تصور بھی مجھے بکھیر دیتا۔

اب میری یادیں مجھے دکھی کرنے کی قوت کھو بیٹھی تھیں لیکن جب میں نے اپنے ذہن کو کریدنے کی کوشش کی، میرے تصور میں کچھ بھی چیز جگہ نہ پا سکی......اور پھر مجھے پاس اس کی کوئی تصویر بھی تو نہیں تھی۔

مجھے اس قسم کی چیز کی ضرورت بھی کیوں محسوس ہوتی؟

اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے فاؤڈو پکے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم ساتھ سٹیشن کی جانب چل دیئے۔

اسے عمومی طور پر ترکی اور خاص طور پر انقرہ بہت پسند تھا۔

''میں نے آج تک ایسا ملک نہیں دیکھا جو غیر ملکیوں کا اس قدر گرم جوشی سے خیر مقدم کرتا ہو۔ مثال کے طور پر سوئٹزرلینڈ کا ہی سوچو، جس کی خوشحالی ان غیر ملکیوں کے دم قدم سے ہے جو وہاں سیاحت کے لیے جاتے ہیں۔ وہاں لوگ غیر ملکیوں کو ایسے دیکھتے ہیں کہ جسے وہ ان کے گھر لُوٹ لیں گے......لیکن یہاں ہر کوئی کسی اجنبی کی مدد کرنے لیے دل و آنکھیں پیش کر دیتا ہے۔ اور انقرہ تو واقعی شان دار ہے۔''

یہ بوڑھی خاتون بچوں کی سی باتیں کرتی رہی۔ وہ چھوٹی لڑکی اس سے محض پانچ یا دس قدم آگے تھی اور سڑک کنارے درختوں کو چھوتے ہوئے چل رہی تھی۔ ہم اس وقت سٹیشن کے تقریباً قریب پہنچ گئے تھے جب بالآخر مجھ میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا۔ اپنی طرف سے قطعی لاتعلقی کی

بے مثال اداکاری کرتے ہوئے میں نے پوچھا: ''کیا برلن میں تمہارے بہت سے رشتہ دار ہیں؟''

''نہیں، کچھ زیادہ نہیں...... میرا تعلق دراصل پراگ سے ہے...... میں ایک چیک جرمن ہوں...... میرا سابقہ خاوند ڈچ تھا۔تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ جب میں برلن میں تھا تو مجھے ایک خاتون ملی تھی جس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہاری رشتہ دار ہے......''

''کہاں؟''

''برلن میں...... ایک نمائش کے موقع پر ہماری ملاقات ہوئی تھی...... میرا خیال ہے کہ وہ ایک مصورہ تھی......''

اچانک وہ میری طرف پوری طرف متوجہ ہوگئی۔''ہاں......تو پھر؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا،''اور......پھر...... مجھے نہیں معلوم...... ہمارے درمیان ایک دفعہ بات چیت ہوئی تھی...... اس نے ایک بہت ہی خوبصورت تصویر بنائی تھی...... اور اس طرح ہماری ملاقات ہوئی......''

''کیا تمہیں اس کا نام یاد ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اس کا نام ماریا پوڈر تھا...... ہاں! ماریا پوڈر! تصویر کے نیچے یہی نام لکھا تھا۔اور کیٹلاگ میں بھی......''

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک دفعہ پھر اپنی ہمت مجتمع کی: ''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''ہاں،لیکن اس نے تمہیں یہ کس طرح بتایا کہ ہم رشتہ دار ہیں؟''

''مجھے علم نہیں...... میرا خیال ہے کہ جب میں نے اسے پنشن کے متعلق بتایا تھا تو اسے مجھے یہی بتایا ہوگا کہ پنشن میں اس کی ایک رشتہ دار بھی رہتی ہے...... یا پھر کوئی دوسری بات تھی...... میں صحیح طور پر نہیں بتا سکتا...... یہ دس برس پہلے کی بات ہے۔''

''ہاں......دس برس تو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے......اس کی والدہ نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ اس کا ایک ترک دوست تھا اور وہ ہر وقت اسی کے متعلق بات کرتی رہتی تھی،اس لیے میں

سوچ رہی تھی کہ تم ہی وہ شخص ہو۔ لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس کی ماں کبھی اس ترک سے نہیں ملی تھی، اس کی بیٹی جس کی اس قدر تعریف کرتی تھی...... وہ اس برس پراگ چلی گئی تھی اور وہیں اس کی بیٹی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ترک طالب علم، برلن سے چھوڑ گیا ہے۔''

اسی اثنا میں ہم سٹیشن پہنچ گئے۔ فاؤ ڈوپکے اپنی ہی رو میں بہے جارہی تھی اور مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نے اس کی بات قطع کرنے کی کوشش کی تو وہ سب کچھ مجھے معلوم نہیں ہو سکے گا جو میں واقعی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تاکہ اسے میری آنکھوں میں اس حوالے سے دلچسپی نظر آجائے کہ میں اس سے کچھ مزید سننا چاہتا تھا۔

ہوٹل کے اس قلی کو رخصت کرنے کے بعد جس نے اس کا سامان ریل گاڑی کے ڈبے میں رکھا تھا، وہ میری طرف مڑی اور کہنے لگی: ''تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟ تم تو کہتے تھے کہ تم اسے بمشکل جانتے تھے؟''

''ہاں...... لیکن اس نے مجھ پر بہت گہرا تاثر چھوڑا تھا...... میں اس کی مصوری سے بہت متاثر ہوا تھا......''

''وہ ایک بہترین مصورہ تھی......''

ایک فوری خدشے کی پیش نظر میں اس کی بات نہ سمجھ سکا اور اس سے پوچھا: ''تم نے کہا کہ وہ ایک بہترین مصورہ تھی؟ اور اب؟''

اس نے بچی کی تلاش میں اردگرد دیکھا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ پہلے ہی ریل گاڑی کے مخصوص ڈبے میں اپنی نشست پر بیٹھ چکی تھی، فاؤ ڈوپکے میری طرف جھکی: ''نہیں...... کیوں کہ وہ زندہ نہیں۔''

''کک...... کیا......؟''

یہ الفاظ میرے ہونٹوں سے سیٹی کی مانند نکلے جس کے باعث لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے۔ چھوٹی بچی نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا اور مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

فاؤ ڈوپکے نے مجھ پر ایک طویل استفہامیہ نظر ڈالی۔ ''اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہو؟'' اس نے کہا، ''تمہارا رنگ زرد ہو رہا ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم اسے جانتے بھی نہیں تھے۔''

''بہر حال مجھے یہ سن کر صدمہ پہنچا کہ وہ مر چکی ہے۔''

''ہاں...... لیکن ...... یہ...... اب کی بات نہیں...... یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔''

''دس برس قبل...... ناممکن......!''

اس نے مجھ پر ایک اور متجسس نظر ڈالی اور مجھے ایک طرف لے گئی۔ ''اب میں واضح طور پر دیکھ سکتی ہوں کہ ماریا پوڈر کی موت نے تمہیں واقعی پریشان کر کے رکھ دیا ہے، اس لیے مجھے جلدی سے یہ قصہ سنانے دو۔ جب تم ترکی جانے کے لیے پنشن سے روانہ ہوئے، اس سے دو ہفتے بعد میں اور ڈوبکے بھی یہاں سے رخصت ہوئے اور ان عزیزوں سے ملاقات کے لیے چلے گئے جو پراگ کے مضافات میں رہتے تھے۔ وہیں ہمیں ماریا پوڈر اور اس کی والدہ سے ملنے کا موقع ملا۔ اس وقت اس کی والدہ کے ساتھ میرے تعلقات اچھے نہیں تھے، لیکن یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ ماریا بہت ہی کمزور اور لاغر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ برلن میں شدید بیمار ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد ماں بیٹی، دونوں برلن چلی گئیں۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ماریا کی صحت کچھ بہتر ہوگئی تھی۔ لیکن اس وقت ہم مشرقی پرشیا چلے گئے جو میرے شوہر کا وطن ہے...... جب ہم اس موسم سرما برلن واپس لوٹے، ہم نے سنا کہ ماریا پورڈ تو اکتوبر کے اوائل میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔ فطری طور پر میں نے اس کی والدہ سے اپنے اختلافات بھلا دیئے اور اس کے پاس چلی گئی۔ وہ ساٹھ سالہ خاتون کی مانند بہت ہی کمزور دکھائی دے رہی تھی حالاں کہ اس کی عمر چالیس پینتالیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ پراگ سے روانہ ہوئے تو ماریا کو اپنے بدن میں کچھ تبدیلیاں محسوس ہونے لگیں۔ جب وہ معالج کے پاس گئے تو اس نے بتایا کہ وہ تو حاملہ ہے۔ شروع میں تو وہ بہت ہی خوش ہوئی لیکن اپنی ماں کی بے حد التجاؤں کے باوجود اس نے نہیں بتایا کہ بچے کا باپ کون ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ وہ اسے خود تلاش کرے گی جبکہ اس نے ایک متوقع سفر کے متعلق بھی بات کی۔ حمل کے آخری مہینوں میں، اس کی صحت بہت زیادہ خراب ہوگئی اور ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کی زندگی کو خطرہ تھا۔ حالاں کہ تاخیر ہو چکی تھی، وہ چاہتے تھے کہ وہ آپریشن کر دیں۔ ماریا نے اس کی اجازت نہیں دی اور اچانک وہ شدید بیمار پڑ گئی۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں البومن کی مقدار بہت کم ہو چکی

تھی......اس کا بدن اپنی بیماری سے جنگ لڑ رہا تھا......زچگی کے لیے لے جانے سے پہلے وہ کئی بار بے ہوش ہوئی تھی۔اس لیے ڈاکٹروں نے آپریشن کیا اور بچے کو بچالیا۔لیکن ماریا مسلسل بے ہوش رہی اور ایک ہفتہ بعد وہ کوما کی حالت میں اس دنیا سے گزر گئی۔اس نے کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مرجائے گی۔جب مرنے سے کچھ دیر پہلے وہ ہوش میں آئی تو اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اسے کس قدر صدمہ پہنچے گا جب وہ اپنی والدہ کو پورا قصہ سنائے گی لیکن آخر میں بذات خود وہ بہت خوش ہوگی۔لیکن اس نے بچے کے باپ کا نام کبھی نہیں بتایا۔اس کی ماں یاد کرتی تھی کہ اس کی بیٹی اکثر ایک ترک کے متعلق باتیں کرتی لیکن وہ اس سے ملی اور نہ ہی اس کا نام جانتی تھی...... بچی ہسپتالوں اور نرسریوں میں پلتی رہی اور جب وہ چار برس کی ہوئی تو اپنی نانی کے پاس چلی گئی۔وہ بہت کمزور اور لاغر لیکن بہت ہی پُرکشش بچی ہے......کیا تمہارا بھی یہی خیال نہیں؟''

میرا خیال تھا کہ میں اب گر پڑوں گا۔میرا سر چکرانے لگا لیکن میں نے ہمت پیدا کی، میں کھڑا رہا اور مسکراتا بھی رہا۔

''وہ لڑکی؟''میں نے ڈبے کی کھڑکی کے اندر اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......وہ بہت ہی پیاری بچی ہے،کیا ایسا نہیں؟ بہت ہی کم گو اور مہذب! کون جانتا ہے کہ وہ اپنی نانی کے بغیر کس قدر اداس ہے؟''

یہ بات کہنے کے دوران وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں کی چمک سے مجھے خوف آرہا تھا۔

ریل گاڑی اب چلنے ہی کو تھی،وہ ڈبے میں سوار ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں کھڑکی پر آئیں۔بے اعتنائی کے عالم میں مسکراتے ہوئے لڑکی سٹیشن کو دیکھ رہی تھی جبکہ کبھی کبھار وہ مجھ پر بھی نظر ڈال لیتی۔اس کے پاس موجود موٹی بوڑھی عورت نے مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

جیسے ہی ریل گاڑی آگے بڑھی،میں نے ہاتھ ہلانا شروع کیا لیکن آخری بار مجھے دیکھتے ہوئے فاوَڈو پکے کے ہونٹوں پر منحوس سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔

اس نے بچی کو اندر دھکیل لیا......

یہ سب کچھ گزشتہ رات پیش آیا تھا اور یہ واقعہ پیش آئے ہوئے ابھی محض چوبیس گھنٹے ہی گزر رہے ہیں۔

میں گزشتہ رات ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپک سکا۔ میں بستر پر لیٹا محض اس بچی کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ چلتی ہوئی ریل گاڑی میں بچی کا سر بھی آگے پیچھے جھول رہا ہے۔ اور اس کے بال...... اس کے سر پر بہت زیادہ بال تھے...... لیکن بالوں کا رنگ مجھے بھول گیا، اس کی آنکھوں کا رنگ بھی مجھے یاد نہیں رہا۔ میں نے اس کا نام نہیں پوچھا تھا، میں نے اس کی طرف اپنی توجہ مرکوز نہیں کی تھی۔ اگرچہ ایک مرحلے پر وہ مجھ سے محض ایک قدم دور تھی، میں نے اسے غور سے بھی نہیں دیکھا۔ الوداع کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ بھی نہیں تھاما۔ اور چوں کہ مجھے کچھ علم نہیں تھا، میرے خدا...... میں اپنی بچی کے متعلق واقعتاً کچھ نہیں جانتا تھا۔ بلاشبہ، فاؤ ڈو پکے کو کچھ محسوس ہو گیا تھا...... اس نے اس قسم کے کینہ کے ساتھ مجھے کیوں دیکھا تھا؟ بلاشبہ اسے سب سمجھ آ گئی تھی...... اور پھر اس لڑکی کو ساتھ لیے وہ چل دی تھی...... وہ اس وقت سفر کر رہے ہیں...... ریل گاڑی کے پہیے پٹریوں پر دوڑ رہے ہیں اور اس کی گود میں سوئی ہوئی میری بیٹی آہستہ آہستہ ہچکولے رہی ہے۔

دن کے ہر لمحے میں نے خیالوں میں ان کا تعاقب کیا۔ اور پھر آخر کار میں اس سے زیادہ نہیں سوچ سکتا تھا، جو شبیہ میں نے اپنے ذہن سے تشکیل کی تھی، جلد ہی مجسم ہونے لگی تھی، جلدی جلدی اور تیزی سے...... وہ میرے سامنے متشکل ہو رہی تھی: ماریا پوڈر...... اپنی سیاہ آنکھوں اور گہری نگاہوں کے ساتھ، خوبصورت تراشیدہ ہونٹوں کے ساتھ۔ میری فرکوٹ والی میڈونا۔ اس کے چہرے پر غصے یا وحشت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ شاید حیرانی کا تاثر موجود تھا لیکن اس سے بھی زیادہ اس کے چہرے پر تفکر اور ہمدردی نظر آ رہی تھی۔ لیکن مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ اس سے آنکھیں چار کر سکوں۔ دس برس تک، پورے دس برس تک میں ایک مری ہوئی عورت سے نفرت کرتا اور اسے ملامت کا نشانہ بناتا رہا...... اس کی آنکھوں میں میرے لیے توہین و تحقیر کیوں نہ موجود ہوتی؟ دس برس تک میں غلط اور یکطرفہ طور پر اس شخص پر شک کرتا رہا جو میری

زندگی تھا...... میری روح تھا...... میری زندگی کا مقصد تھا...... ایک بار بھی یہ سوچے بغیر کہ میں اس سے ناانصافی کر رہا تھا۔ جو بھی خیرہ کن ممکنہ مناظر میں نے سوچے تھے، ان میں مَیں نے ایک مرتبہ بھی نہ پوچھا کہ مجھے چھوڑنے کی اس کے پاس کیا معقول وجہ تھی۔ اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ ایک وجہ، بہت ہی سنگین وجہ، انتہائی ناقابل گریز وجہ...... موت...... موجود تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں شرمندگی سے مر ہی جاؤں گا۔ میں انتہائی مایوسی اور غیر ضروری پشیمانی کا سامنا کر رہا تھا جو موت کے پیش نظر ہمیں محسوس ہوتی۔ اگر مجھے اپنی باقی عمر عجز سے، اس کی یاد فراموش کر دینے پر معافی طلب کرتے ہوئے بسر کرنی تھی تو مجھے خدشہ تھا کہ میں کامیاب نہ ہو پاؤں گا...... کیوں کہ عظیم ترین بے وفائی، وہ عظیم ترین گناہ جس کا ارتکاب ہم ان لوگوں کے خلاف کر سکتے ہیں جو بالکل بے قصور تھے، وہ تھا اپنے محبت افروز دل کو ترک کر دینا اور اس ارتکاب کے بعد میرے لیے کوئی معافی ممکن ہی نہ تھی۔

محض چند گھنٹے پہلے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی کوئی تصویر نہ ہونے کی صورت میں، میں اس کے چہرے کا دوبارہ تصور نہیں کر سکوں گا۔

لیکن اب میں اسے دیکھ سکتا ہوں، اس کے حسن کی ہر لکیر دیکھ سکتا ہوں اور وہ اس وقت اپنی اس زندگی کی نسبت کہیں زیادہ جیتی جاگتی ہے۔ اور اپنی ہی تصویر میں وہ قدرے متفکر لیکن قدرے مغرور نظر آتی ہے۔ اس کا چہرہ قدرے زرد ہے، اس کی آنکھیں گہری سیاہ ہیں۔ اس کا نچلا ہونٹ باہر کی طرف نکلا ہوا ہے کہ جیسے وہ کہہ رہی ہو، ''اوہ راعف!'' ہاں، وہ پہلے سے کہیں زیادہ جیتی جاگتی اور زندہ تھی...... تو وہ دس برس قبل مر گئی تھی! جبکہ میں اس کا منتظر تھا، اس کے لیے گھر تیار کر رہا تھا۔ میرے متعلق کسی کو ایک لفظ بتائے بغیر وہ مر گئی تاکہ مجھے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اور پھر وہ اپنا راز اپنے سینے میں دفن کیے مر گئی۔

اور پھر مجھے اپنے اس غصے کی سمجھ آ گئی جو میں نے ان دس برس کے دوران اس کے لیے محسوس کیا تھا...... اور میں کیوں نہ ایک ناقابل تسخیر دیوار اپنے اور دنیا کے درمیان تعمیر نہ کرتا؛ دس برس میں اس سے گہری محبت کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کسی کو بھی اس کی جگہ نہیں لینے دی۔ لیکن اب مجھے اس سے پہلے سے کہیں زیادہ محبت تھی۔ اس شبیہ کے لیے اپنے بازو کھولتے ہوئے جو

ماریا کی تھی، میں نے تصور میں دیکھا کہ میں نے اس کے ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور انہیں رگڑ کر مزید گرم کر رہا تھا۔ میں ان مہینوں کی ہر تفصیل کا تصور کر سکتا تھا جو ہم نے ساتھ بسر کیے تھے، ان لمحوں کا تصور کر سکتا تھا جو ہم نے ساتھ گزارے کیے تھے، ہر اس لفظ کا تصور کر سکتا تھا جو ہم نے ایک دوسرے سے کہا تھا۔ اس لمحے کی طرف لوٹتے ہوئے جب میں نے پہلی بار اس کی تصویر نمائش میں دیکھی تھی، میں اس لمحے میں بھرپور زندہ ہو گیا؛ میں نے اسے اٹلانٹک میں نغمہ سرائی کرتے ہوئے دیکھا؛ اور پھر وہ میرے قریب آئی اور میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ہم نے نباتاتی باغ کی سیر کی، ایک کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے اور پھر وہ بیمار ہو گئی۔ یہ یادیں اس قدر بھرپور تھیں کہ ان کے سہارے پوری زندگی بسر کی جا سکتی تھی۔ اس قدر مختصر عرصے میں محدود، یہ یادیں اس قدر بھرپور اور متحرک تھیں کہ ان سے زیادہ حقیقی کوئی یادیں ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ ان یادوں نے مجھے بتا دیا کہ گزشتہ دس برس کے دوران میں ایک لمحہ بھی حقیقتاً زندہ نہیں رہا...... میرے خیالات، احساسات اور افعال، مجھ سے کہیں دُور سفر کر رہے تھے...... یوں جیسے ان کا تعلق کسی اجنبی سے ہو۔ اس وقت میری عمر لگ بھگ پینتیس برس ہو گی، لیکن میری اصلی ذات، میرا حقیقی وجود، دس برس قبل محض چار یا پانچ ماہ زندہ رہا تھا؛ اور اس کے بعد میں نے خود کو ایک اجنبی خول میں بند کر لیا کہ جیسے میں کچھ بھی نہیں۔

گزشتہ رات بستر پر لیٹے ہوئے، جب میں نے ماریا کو اپنے سامنے دیکھا، میں سمجھ گیا کہ کس قدر مشکل ہے کہ اپنے اس بدن اس ذہن میں جیے جانا، جس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ جب میں کھاتا پیتا، میں گویا کسی اجنبی کو کھلاتا پلاتا۔ میں خود کو ایک جگہ سے دوسری جگہ گھسیٹتا پھرتا، دنیا کو رحم اور ملامت کے ملے جلے احساس سے دیکھتا۔ گزشتہ رات مجھے یہ بھی ادراک ہو گیا کہ اب جبکہ وہ مر چکی ہے، دنیا میں میرے لیے کچھ نہیں: اگر پہلے نہیں تو اس کے ساتھ ضرور میں مر چکا ہوں۔

علی الصباح، تمام گھر والے تفریحی سفر پر روانہ ہو گئے۔ بیمار رہنے کا بہانہ کرتے ہوئے میں گھر پر ہی رہا۔ میں صبح ہی سے لکھ رہا تھا اور اب رات ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹے تھے لیکن جلد ہی گھر میں ان کی چیخ و پکار اور ہنسی گونجنے لگے گی۔ اس میں میرے لیے کیا معانی ہیں؟ جب تمام انسانی رشتے ختم ہو چکے ہیں، باقی کیا رہ گیا ہے؟ میں نے ان دس برس کے دوران

ایک لفظ بھی سچ نہیں بولا۔لیکن اب مجھے اپنے ایک ہم راز کی بہت زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔اب میرے لیے کیا باقی رہ گیا ہے، اب میں محض الفاظ بول اور انہیں صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا؟ اوہ، ماریا، اب ہم کھڑکی کے پاس بیٹھ کر بات کیوں نہیں کر سکتے؟ اب ہم اپنے دل و روح کو ایک دوسرے کے لیے کھول نہیں سکتے جب ہم موسم خزاں کی تیز ہوا میں ایک دن شام کو ساتھ چل رہے تھے؟: اوہ، اس وقت تم میرے پاس یہاں کیوں نہیں ہو؟

شاید میں نے ان دس برس کے دوران غیر ضروری طور پر معاشرے سے قطع تعلق کیا ہے۔شاید ان پر یقین کرنے سے انکار کرتے ہوئے میں نے لوگوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا ہے۔شاید، اگر میں تلاش کرتا تو تم جیسا کوئی پا لیتا۔اگر مجھے تمہاری موت کے متعلق جلدی علم ہو جاتا، تو شاید مجھے وقت مل جاتا کہ کسی میں بھی تمہیں تلاش کرسکوں۔لیکن اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔عظیم اور نا قابل معافی نا انصافی سے باخبر ہوتے ہوئے میں نے اپنے محبوب پر الزامات عائد کیے۔مجھ میں حالات درست نہج پر لانے کی صلاحیت نہیں۔میں تمام دنیا ہی کو حقیر سمجھتا ہوں کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا؛ میں نے خود کو تمام دنیا سے الگ تھلگ کر لیا ہے۔اب میں سچ کو دیکھ سکتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میں اپنی عمر بھر کی تنہائی کے لیے خود کو موردِ الزام ٹھہراتا ہوں۔زندگی ایک ایسا کھیل ہے جو ایک بار ہی کھیلا جاتا ہے اور میں زندگی کا یہ کھیل ہار چکا ہوں۔اب میرے لیے دوسرا کوئی موقع نہیں ...... میرے آئندہ سال گزشتہ برسوں کی نسبت کہیں زیادہ بدترین ہوں گے۔ میں کسی مشین کی مانند ہر شام خریداری کرتا رہوں گا۔مجھے ان لوگوں سے میل ملاپ رکھنا پڑے گا اور انہیں برداشت بھی کرنا پڑے گا جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔کیا میں کوئی دوسرا طرزِ زندگی اختیار کرسکتا تھا؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔اگر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید میں سچائی سے بے خبر پہلے کی مانند زندگی بسر کر رہا ہوتا۔تم ہی تھیں جس نے مجھے بتایا کہ ایک اور زندگی ممکن ہے، اور یہ بھی کہ مجھ میں بھی روح موجود ہے۔اور اس مین تمہارا قصور نہیں کہ یہ سب کچھ اس قدر جلد ختم ہو گیا ...... شکر ہے کہ تم نے مجھے حقیقی طور پر جینا سکھایا، بتایا کہ واقعی کس طرح زندگی کی جاتی ہے۔ اس طرح کے لمحے زندگی میں کم ہی آتے ہیں، کیا تم بھی یہ نہیں سمجھتیں؟ بچی جو تم چھوڑ کر گئی ہو...... ہماری بیٹی ...... وہ اپنے باپ کو جانے بغیر اس کرۂ ارض کے گوشوں میں بھٹکتی پھرے گی ...... ہم ایک

مرتبہ ملے تھے لیکن مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہ تھا، مجھے تو اس کا نام بھی معلوم نہیں اور مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ رہتی کہاں ہے لیکن وہ ہمیشہ میرے دل، میرے ذہن میں رہے گی۔ اپنے ذہن میں، میں اس کی زندگی کا تصور کیا کروں گا، اور اس زندگی میں اس کے ہمراہ چلوں گا۔ اپنے خوابوں میں اسے بڑا ہوتے دیکھوں گا۔ میں اسے سکول جاتے دیکھوں گا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ آجائے گا اور اس کے اندازِ فکر کا بھی مجھے ادراک ہو جائے گا، اور ان سب کے علاوہ میں کسی بھی متوقع خلا کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں باہر ہونے والا شور سن سکتا ہوں۔ وہ یقیناً واپس آ چکے ہوں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا قلم نہ رکے۔ اس کی تک ہی کیا ہے؟ میں نے بہت زیادہ لکھا لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟ میں کل اپنی بیٹی کو ایک اور نوٹ بک خریدنے کا کہوں گا اور اس نوٹ بک کو چھپا دوں گا۔ میں اسے ایک ایسی جگہ چھپاؤں گا جہاں کوئی اسے تلاش نہیں کر سکے گا کوئی کچھ بھی، کچھ بھی تلاش کر لے، لیکن میری روح نہیں۔

◆

نوٹ بک میں یہ راعف آفندی کی آخری تحریر تھی۔ نوٹ بک کے بقایا صفحات خالی تھے کہ جیسے اس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اپنی اس روح کو آشکار کر دے جو اس نے بہت عرصے سے اور بہت زیادہ خائف ہوتے ہوئے چھپا کر رکھی تھی۔ لیکن ان صفحات پر اپنی روح کو تحریر کی صورت میں بکھیرنے کے بعد وہ خود میں دوبارہ سمٹ گیا تھا، اس نے خود کو دوبارہ خول میں بند کر لیا تھا اور مزید کوئی ایک بھی لفظ نہ کہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ میں نے جو وعدہ کیا تھا، اسے ایفا کرتے ہوئے میں نے نوٹ بک اپنی جیب میں ڈالی اور اس کے گھر روانہ ہو گیا۔ دروازہ کھلتے ہی مجھے ماتم وزاری کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے میں وہاں بے یقینی کے عالم میں کھڑا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ راعف آفندی کو آخری بار دیکھے بغیر واپس جاؤں۔ لیکن اس رات کے بعد جب میں پوری محبت سے اس سے ملا تھا، بھرپور زندگی کے ساتھ، مجھ میں یہ امکان

برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ میں اسے کسی ایسے خالی برتن کی حیثیت سے دیکھوں جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میں واپس چلا آیا۔ راعف آفندی کی موت نے مجھ پر کوئی گہرا اثر مرتب نہیں کیا کیوں کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ میں نے اسے کھونے کی بجائے کسی نہ کسی طرح دریافت کرلیا تھا۔

گزشتہ رات اس نے مجھ سے کہا تھا، ''ہمیں کبھی ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔'' لیکن اب میں مختلف طور پر جانتا تھا۔ گزشتہ شب ہم نے دیر تک باتیں کی تھیں۔

اسی گزشتہ رات، وہ اپنی زندگی سے نکل کر میری زندگی میں سرایت کر گیا تھا۔ اور یہاں وہ حقیقت میں زندہ رہے گا...... کسی بھی دوسرے کی نسبت جسے میں جانتا ہوں۔ جہاں کہیں میں جاؤں گا، وہ میرے پہلو میں موجود ہوگا۔

دفتر پہنچ کر، میں راعف آفندی کی خالی میز پر بیٹھ گیا۔ اس کی سیاہ نوٹ بک اپنے سامنے رکھ کر میں نے پہلا صفحہ کھول لیا......

نومبر 1940ء/فروری 1941ء

''میڈونا'' ترکی کے مقبول ترین ادیب صباح الدین علی کے ناول Kürk Mantolu Madonna کا اردو ترجمہ ہے جو انگریزی میں Madonna in a Fur Coat کے نام سے شائع ہوا۔ ''میڈونا'' ترکی کا مقبول ترین اور بیسٹ سیلر رومانوی ناول ہے۔ صباح الدین علی کے ناولوں کی طرح اس میں بھی شاعرانہ والیہ محبت کا بیان ملتا ہے۔ ادب کی طرف رجحان رکھنے والا ایک بھرپور تخیل کا مالک نوجوان مترجم جو برلن کی ایک آرٹ گیلری میں جرمن آرٹسٹ خاتون کی سیلف پینٹنگ سے مسحور ہو کر اس شبیہ کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

صباحت الدین علی، ترکی کے مقبول ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اور صحافی ہیں۔ وہ 25 فروری 1907ء کو آرڈینو، موجودہ بلغاریہ میں پیدا ہوئے جو تب سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھا اور 2 اپریل 1948ء کو بلغاری سرحد پر کرک قلعہ میں دنیا سے کوچ گئے۔ صباحت الدین علی، استنبول کے ایجوکیشن سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تدریس کے پیشے سے منسلک ہوئے۔ 1928ء میں انہیں وزارتِ تعلیم کی طرف سے جرمنی بھجوایا گیا۔ پھر کچھ عرصہ وزارتِ تعلیم سے منسلک پبلشنگ ادارے میں کام کیا۔ وہ ترجمہ نگاری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کچھ عرصہ سرکاری ڈرامہ کونسل میں بھی اپنے ہنر کا لوہا منوایا۔ اسی اثنا میں انہوں نے استنبول میں، مارکو پاشا نامی ایک اخبار کا اجرا کیا۔ اپنی نظموں اور سیاسی نظریات کے باعث انہیں قید و بند اور مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کی طرف سے مسلسل عتاب کا نشانہ بننے کی وجہ سے انہوں نے ملک سے فرار کا ارادہ کیا، لیکن کرک قلعہ کے نواح میں رہائش پذیر ایک سمگلر کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ ان کی وفات کی کئی دہائیوں بعد بھی ان کے ناول مقبول ترین ہیں۔ ان کی تحریریں بلغاریہ اور ترکی کے نصاب میں شامل ہیں۔

اس سے قبل جمہوری پبلیکیشنز کے تحت ان کے ناول Kuyucaklı Yusuf کا اردو ترجمہ ''کم سخن یوسف'' بھی شائع ہو چکا ہے۔

فرخ سہیل گوئندی